گلِ رعنا

مرتبہ

مالک رام

علمی مجلس
دِلّی

گلِ رعنا

سلسلۂ مطبوعات علمی مجلس، دلی: ۲۳

گلِ رعنا

غالب کے اُردو اور فارسی کلام کا اولین انتخاب

مرتبہ

مالک رام

علمی مجلس، دِلّی

۱۹۷۰ء

گُلِ رعنا از اسداللہ خان غالب

مرتب : مالک رام

مطبع : لکشمی پرنٹنگ ورکس، دلّی ۶

تاریخ اشاعت : مئی ۱۹۷۰ء

ناشر : علمی مجلس، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلّی ۶،

قیمت : سات روپے پچاس پیسے

جناب سید نقی بلگرامی

کی

نذر

مقدّمہ

غالب کی زندگی کا سب سے لمبا سفر کلکتے کا ہے، جب وہ اپنی پنشن کا مقدمہ گورنر جنرل باجلاسِ کونسل کے سامنے پیش کرنے کو گئے ہیں۔ وہ نومبر یا دسمبر ۱۸۲۶ء میں دلّی سے روانہ ہوئے اور مختلف شہروں کی سیر کرتے، اور وہاں کے اکابر و عمائد، شعرا و ادبا سے ملتے، ۲۱ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ یہاں وہ کم و بیش ڈیڑھ برس تک مقیم رہے، اور جب دیکھا کہ کلکتے میں ان کا مزید قیام مقدّمے کے سلسلے میں چنداں مفید ثابت نہیں ہو سکتا، تو انھوں نے ستمبر ۱۸۲۹ء میں دلّی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ واپسی میں وہ رستے میں کسی جگہ زیادہ دِن نہیں ٹھہرے؛ گویا سیدھے آئے۔ وہ ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دلّی وارد ہوئے تھے۔[۲]

کلکتہ اس زمانے میں، انگریزی حکومت کا مرکز ہونے کے باعث، سیاسی اور تجارتی اور سماجی لحاظ سے مشرق کے بڑے شہروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس کی علمی حیثیت بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ مدرسۂ عالیہ اور فورٹ ولیم کالج ـــ یہاں کے دو تعلیمی ادارے ایسے تھے، جنھوں نے اس ملک میں تعلیم کی اشاعت اور ترویج میں بہت اہم اور دیرپا خدمات سرانجام دی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام جو کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ ہوئیں یا براہِ راست اُردو میں لکھی گئیں، ان کی اہمیت کبھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی، حال آنکہ انھیں شائع ہوئے ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا زمانہ گذر چکا ہے۔ فورٹ ولیم کالج تو کب کا ختم ہو گیا، لیکن مدرسۂ عالیہ آج بھی موجود ہے، اور علومِ شرقیہ کی تعلیم و تدریس کا اہم مرکز۔

۱۔ ذکرِ غالب : ۰؎ ۲ ایضاً ۴۴

انگریزی حکومت کے اراکین کے قیام اور ان کی مسلسل آمد و رفت کے باعث مغربی تہذیب و تمدن کی داغ بیل بھی کلکتے ہی میں پڑی، جو رفتہ رفتہ بڑھ کر پورے ملک میں نفوذ کرگیا، بلکہ اس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ایسے تہذیبی اور سماجی اور علمی ماحول میں ڈیڑھ سال کا قیام ایسا نہیں تھا جو غالب کے سے ذہین اور اخاذ شخص کو متاثر نہ کرتا۔ وہ زندگی بھر کے لیے انگریزی حکومت اور اس کی اختراعات اور اس کے علوم و فنون کے بیحد گرویدہ ہو گئے، یہاں تک کہ ان کے مقابلے میں انھیں اکبری دور کا نظم و نسق اور اس کی معاشرت بھی، اپنی پوری تابناکی کے باوجود، تقویم پارینہ سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔

یہیں کلکتے میں انھیں ایرانی تاجروں اور لازماً کچھ ادیبوں سے بھی ملاقات کا موقع ملا، جو ایک طرح سے ترکِ وطن کر کے یہیں کے مستقل باشندے بن چکے تھے۔ ان کی فارسی کی استعداد ملا عبدالصمد کی صحبت کے طفیل، زمانۂ طالبعلمی ہی سے بلند پایہ تھی، اور وہ فارسی کی کلاسیکی شاعری اور زبان کے ماہر اور معتقد تھے۔ قیامِ کلکتہ نے گویا سونے میں سہاگے کا کام دیا۔

یہیں مدرسۂ عالیہ کے ایک مشاعرے میں ان کے بعض شعروں پر مرزا محمد حسن قتیل کی سند سے اعتراض کیا گیا، جس نے انھیں مدت العمر کے لیے نہ صرف قتیل کا، بلکہ ہندستان بھر کے جملہ فارسی کے ادیبوں کا مخالف بنا دیا۔ پس اگر ہم کہیں کہ کلکتے کا سفر غالب کی زندگی میں سنگِ میل اور اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، تو اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہیں ہوگا۔

کلکتے میں منجملہ اور اصحاب کے ان کی مولوی سراج الدین احمد سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے نام تعارفی خط انھیں مولوی محمد علی خان صدر امینِ باندہ نے دیا تھا، جنھوں نے اثنائے سفرِ کلکتہ میں قیامِ باندہ کے زمانے میں ان سے بہت لطف و کرم کا اظہار کیا تھا، اور بعد کو بھی ہمیشہ ان کے ہمدرد اور غمگسار رہے۔ "نامہ ہاے فارسی غالب" کے بیشتر خطوط انھیں کے نام ہیں۔

رفتہ رفتہ غالب کے مولوی سراج الدین احمد سے تعلقات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگئی۔ غالب نے اپنے ایک مقطعے میں ان کا ذکر کیا ہے:

باسراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ، غالب! نیست آہنگِ غزلخوانی مرا

پہلے مصرعِ ثانی کی شکل یہ تھی: ورنہ، غالب میگزد ذوقِ غزلخوانی مرا۔ پنج آہنگ (آہنگ پنجم) میں سب سے زیادہ خط انھیں سراج الدین احمد کے نام ہیں۔ ان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں؛ اور جو کچھ معلوم ہیں، وہ بھی خود غالب ہی کی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان کا کلکتے کے ہفتہ وار فارسی اخبار آیینۂ سکندر سے قریبی تعلق تھا، بلکہ وہ غالباً اس کے مدیر تھے[3]۔ مولوی سراج الدین احمد کا کلکتے کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں بھی اچھا خاصا رسوخ تھا۔ وہ میرزا کے دلی دوست اور رازدان اور پنشن کے مقدمے میں ان کے معاون و معین تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے ۱۸۴۵ء میں جب غالب کا فارسی دیوان زیرِ طبع تھا، اکبرآباد میں مقیم تھے۔ اس زمانے میں غالب کے شاگرد منشی جواہر سنگھ (خلف رائے چھجمل) بھی اپنی ملازمت کے سلسلے میں وہیں تھے۔ غالب نے جواہر سنگھ کو لکھا کہ ان سے ملتے رہو؛ اس سے تمھارے علم میں بھی اضافہ ہوگا اور دنیوی ترقی کے وسائل بھی فراہم ہوں گے[4]۔ اس کے بعد پھر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں ان کا ذکر آیا ہے۔

غالب نے اپنی کتاب دستنبو پہلی مرتبہ ۱۸۵۸ء میں آگرے کے منشی شیو نراین کے مطبع مفید خلائق میں چھپوائی تھی۔ انھوں نے اس کتاب کے نسخے احباب کو بھجوائے تھے۔ ایک خط میں منشی شیو نراین کو لکھتے ہیں[5]:

> دو پارسل الگ الگ لکھنؤ کو ارسال کرو؛ آنے آنے کا ٹکٹ اس پر لگا دو
>
> .... دوسرے پارسل پر یہی عبارت، مگر مکان کا پتا، نام اَور: در لکھنؤ بہ احاطۂ

۳۔ کلیاتِ نثرِ غالب (فارسی): ۶۴ ۴۔ باغِ دودر: ۱۱۳-۱۱۶ (خط ۲۰۱)

۵۔ خطوطِ غالب (مرتبہ مالک رام): ۴۳۳-۴۳۴

خانساماں، متصلِ تکیۂ شیر علی شاہ، بہ مکاناتِ مولوی عبدالکریم مرحوم بخدمت مولوی

سراج الدین احمد صاحب برسد۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۸۵۹ء کے آغاز میں لکھنؤ میں تھے۔ اس کے بعد ان کا ذکر ایک دوسرے خط میں یوں ملتا ہے۔ منشی غلام غوث خان بیخبر کو لکھتے ہیں[6]:

ستر برس کی عمر ہے۔ بےمبالغہ کہتا ہوں: ستر ہزار آدمی نظر سے گذرے ہونگے زمرۂ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولا دیکھے: ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم۔ لیکن وہ مرحوم حُسنِ صورت نہیں رکھتا تھا، اور خلوصِ اخلاص اوس کا خاص میرے ساتھ تھا.... پہلے دو آدمیوں کو اپنے بعد اپنا ماتمدار سمجھا ہوا تھا۔ ایک کو تو میں رو لیا؛ اب اللہ آمین کا ایک دوست رہ گیا۔

یہ خط قریب بہ یقین ۱۸۶۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سراج الدین احمد اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ کتنا پہلے، اس سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال اتنا ثابت ہے کہ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۴ء کے درمیانی زمانے میں ان کا انتقال ہوا۔

غالب کا کلام آئینۂ سکندر میں چھپتا رہا تھا۔ مولوی سراج الدین احمد ان کے درجۂ شاعری کے مخلص معترف تھے۔ غالب دلی سے بھی اپنی نظم و نثر انھیں ہمیشہ بھیجتے رہے[7]۔ ان کے قیامِ کلکتہ کے زمانے میں انھوں نے میرزا سے فرمایش کی کہ میرے لیے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب تیار کر دیجیے۔ اس پر زیرِ نظر مجموعہ **گلِ رعنا** وجود میں آیا۔

بدقسمتی سے یہ انتخاب نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اگر اس کے دیباچے اور خاتمے کی فارسی عبارتیں ان کے کلیاتِ نثر (فارسی) میں شامل نہ ہو گئی ہوتیں، تو کسی کو اس کے عالمِ وجود میں آنے تک کا علم نہ ہوتا۔ حسرت موہانی مرحوم کو اس کے چند اوراق سراج الدین علی خان موجد موہانی

۶۔ عودِ ہندی: ۱۱۳ — ۷۔ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۵۷

(ف ۱۲۳۸ھ) کے ورثا سے دستیاب ہوئے تھے۔ انھوں نے جب دیوانِ غالب مرتب کیا اور اس پر تشریحی حواشی قلمبند کیے، تو ان اوراق سے لے کر وہ اشعار بھی شاملِ دیوان کر دیے، جو ہنوز کہیں نہیں چھپے تھے۔ بد قسمتی سے حسرت کی وفات (۱۳ مئی ۱۹۵۱ء) کے بعد ان کے پسماندگان کی غفلت سے ان کا بیش بہا اور نادرِ روزگار کتابخانہ برباد ہو گیا اور اس کے ساتھ یہ چند ورق بھی ضائع ہو گئے اور بالآخریوں وہ نشان بھی مٹ گیا، جو خوشبختی سے دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا تھا۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی، تو نے، اے بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

۲

میں اپنی سرکاری ملازمت کے دوران میں چندے مرکزی حکومت کے شعبۂ تجارتِ درآمد و برآمد میں رہا ہوں (۱۹۵۶-۱۹۵۸ء)۔ یہاں میرے افسرِ اعلیٰ جناب سیّد نقی بلگرامی تھے۔ ہم دیر تک ایک دوسرے سے ناآشنا رہے۔ میں ہمیشہ سے عزلت گزیں اور نمود و نمایش سے گریزاں رہا ہوں۔ اس لیے میری طرف سے پہل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بارے، خود انھوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا؛ اور اس کے بعد جس جس لطف و نوازش سے وہ مجھ سے پیش آئے ہیں، اس کا اب کیا ذکر کروں! اس سے مجھے بارہا افسوس ہوا کہ میں آج تک کیوں ان سے نہیں ملا تھا۔ بہرحال یہ ایک دوسری داستان ہے اور اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

ایک دن انھوں نے فرمایا کہ میں کل حیدر آباد جانے والا ہوں، وہاں کا کوئی کام ہو تو بتائیے۔ میں غالب کے سوائے کسی اور چیز کی فرمایش کیا کرتا! غالب سے متعلق میرا ذخیرہ تقریباً مکمل ہے، لیکن بد قسمتی سے اس میں دیوانِ اردو (طبع اول) کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ میں نے گذارش کی کہ حیدر آباد کے قدیم علمی خاندانوں میں ممکن ہے، کسی جگہ یہ طبعِ اول کا نسخہ

موجود ہو۔ اگر ہو سکے، تو اسے کہیں سے پیدا کیجیے۔ انھوں نے تلاش کا وعدہ فرمایا۔

چند دن بعد وہ دلّی مراجعت فرما ہوئے، تو مجھے بلا بھیجا۔ میں حاضر ہوا۔ بلگرامی صاحب نے مجھے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی، اور خود بھی بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے میز پر اوپر تلے دو کتابیں رکھی تھیں۔ اوپر کی کتاب چھوٹے سائز کی، قدرے ضخیم تھی؛ اس کی جلد چمڑے کی اور مکلف تھی۔ نیچے کی پتلی سی، اَبری اور کپڑے کی معمولی جلد تھی۔ اس کی حالت اتنی خستہ تھی کہ جگہ جگہ سے اَبری اُڑ چکی تھی اور پشتے کا کپڑا بھی پھٹا ہوا تھا۔ میں نے پہنچتے کے ساتھ ہی دونوں کتابوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور خاموش ہو رہا۔ فرمایا: میں نے وہاں بعض احباب سے آپ کی فرمایش کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے، کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن میں نے خیال کیا کہ خالی ہاتھ واپس کیا آؤں۔ دادا جان مرحوم کا کتب خانہ تو، آپ کو معلوم ہے، ان کی وصیت کے مطابق ہم نے عثمانیہ یونیورسٹی اور آصفیہ لائبریری میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر بھی چند کتابیں اِدھر اُدھر پڑی رہ گئی تھیں۔ انھیں میں سے یہ دو میں آپ کے لیے تحفہ لیتا آیا ہوں۔ (اوپر کی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے) یہ ان کی ذاتی بیاض ہے؛ خوب خوب شعر ہیں اس میں۔ میں نے کتاب ہاتھ میں لے لی۔ اس میں بیشتر کلام فارسی کے کلاسکی اساتذہ کا تھا۔ اس کتاب کے اُٹھا لینے سے نیچے کی کتاب اب پوری کی پوری نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے وسط میں سفید کاغذ کی چیپی لگی ہے جس پر لکھا تھا: متفرق کلامِ غالب۔ یہ امرِ واقع ہے کہ اس سے میرے دل میں کوئی کشش نہیں پیدا ہوئی؛ یہی خیال ہوا کہ ان کے دادا جان مرحوم نے غالب کے کلام سے اپنی پسند کے کچھ متفرق اشعار انتخاب کر کے اس میں لکھ لیے ہوں گے۔ میں ابھی بیاض کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا کہ کہنے لگے: اس (دوسری کتاب) میں غالب کے شعر بہت غلط لکھے ہیں۔ اس پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جیسے آنکھوں کے سامنے بجلی کوند جائے؛ اچانک میرے ذہن میں خیال گذرا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان کے دادا جان نواب عماد الملک مرحوم نے شعر غلط لکھے ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس میں غالب کا ابتدائی کلام ہو۔ چنانچہ میں نے جلدی سے بیاض ہاتھ سے رکھ دی اور وہ پتلی کتاب اُٹھالی۔ جونہی میں نے

اسے کھولا اور خصوصاً آغاز و انجام کے صفحے ایک نظر دیکھے، میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں کتاب ہاتھ میں لیے فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور بلگرامی صاحب سے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے جانے کی اجازت تو دے دی، لیکن میری کیفیت دیکھتے ہوئے پوچھا کہ خیر تو ہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ خدا معلوم میں نے کیا جواب دیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شاید میں نے ان کی بات بھی پورے طور پر نہیں سنی تھی۔ میں لپک کر کمرے پر آیا اور اپنے چپراسی سے کہا کہ دیکھو، اگر بلگرامی صاحب بلا بھیجیں تو خیر، مجھے اطلاع دے دینا؛ ورنہ کوئی اور صاحب پوچھیں، تو میں موجود نہیں ہوں۔ یہ کہ کر میں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ اب میں نے اطمینان اور احتیاط سے یہ پتلی سی کتاب دیکھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گلِ رعنا ہے — غالب کا اولین انتخاب، جو ناپید ہو چکا تھا؛ اس کا وحید قلمی نسخہ میرے ہاتھ میں تھا۔ آپ میری مسرّت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس رات مجھے ٹھیک سی نیند نہیں آئی۔

یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ میں اس کے چند مہینے بعد اپریل ۱۹۵۸ء میں، اپنی ملازمت کے سلسلے میں، پھر ملک سے باہر چلا گیا۔ روانگی سے قبل میں نے ایک مبسوط مضمون اس کے بہرۂ اُردو سے متعلق 'نذرِ ذاکر' کے لیے تیار کیا، جو زیرِ ترتیب تھی۔ میں بلجیم میں تھا کہ نیاز فتحپوری مرحوم کا خط ملا کہ 'نگار' کا غالب نمبر شائع کرنا چاہتا ہوں، غالب کی فارسی تصنیفات سے متعلق ایک مضمون بھیج دو۔ میں نے تعمیلِ حکم میں تو مضمون لکھا ہی، لیکن از خود ایک اور مضمون گلِ رعنا کے بہرۂ فارسی سے متعلق بھی لکھ کر انھیں بھیج دیا۔ انھوں نے یہ دونوں شاملِ اشاعت کر لیے۔ میں چھ سال بعد ۱۹۶۴ء کے وسط میں وطن واپس آیا۔ یہاں غالب صد سالہ یادگار منانے کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اب میں نے خیال کیا کہ پوری کتاب کو ٹھیک سے مرتب کر کے شائع کر دینا چاہیے؛ اور اس کے لیے غالب صد سالہ برسی کی یہ تقریب (۱۹۶۹ء) بہت موزوں موقع معلوم ہوا۔ لیکن یادگار کمیٹی کے اربابِ حل و عقد کو بھی میری واپسی کی اطلاع مل گئی اور بتدریج میں ان کے ساتھ اس تقریب کی تیاریوں اور سرگرمیوں میں الجھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس موقع پر

گُلِ رعنا شائع نہ کر سکا۔ شکر ہے کہ اب سال بھر بعد یہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔

۳

لیکن اس 'جملۂ معترضہ' میں ایک بات رہ گئی۔ بلگرامی صاحب کون ہیں اور یہ خطی نسخہ ان کے پاس کیونکر پہنچا؟ پہلے ان کا شجرۂ نسب[۸] دیکھیے:

مولوی سید کرم حسین بلگرامی (خان بہادر)
(ف ۱۲۵۷ھ)

- سید اعظم الدین حسن (خان بہادر، سی ایس آئی)
- سید زین الدین حسین (خان بہادر)
  - عماد الملک سید حسین بلگرامی (= عباسی بیگم بنت محمد زکی)
    - زین العابدین
    - ہاشم
    - سر عقیل جنگ (سید عقیل بلگرامی) (ف ۱۹۴۵ء)
      - سید نقی بلگرامی (= مریم)
    - مہدی یار جنگ (سید مہدی حسین) (ف ۱۹۴۸ء)
      - مریم (= سید نقی بلگرامی)
      - بتول (= باقر ظہیر بن سر وزیر حسن)
      - زہرا (= علی یاور جنگ)
    - طیبہ
      - خدیو جنگ (کریم خان ایرانی)
        - علی یاور جنگ (= زہرا)
  - بدر الدین حسین (= نجفی بیگم بنت محمد ہادی)
    - خدیجہ (= خلیفہ حامد حسین، پٹیالہ)
  - محمد (لاولد)
  - سید علی بلگرامی (شمس العلما) (ف مئی ۱۹۱۱ء)
  - میجر سید حسن بلگرامی (ف ۱۹۱۵ء)
  - فاطمہ (= شجاعت علی مدراسی)

سید نقی بلگرامی صاحب کی گفتگو میں 'دادا جان مرحوم' سے مراد نواب عماد الملک عماد الدولہ، موتمن جنگ، علی یار خان، سید حسین بلگرامی تھے۔ یہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو صاحب گنج

۸۔ یہ شجرۂ نسب خود میں نے روضۃ الکرام شجرہ سادات بلگرام مصنفہ سید وصی الحسن بلگرامی سے مرتب کیا ہے۔

(ضلع گیا) بہار میں پیدا ہوئے، جہاں ان دنوں ان کے والد ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے علم وفضل کا کیا کہنا! وہ عربی، فارسی، انگریزی — سب پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ کیننگ کالج، لکھنؤ میں عربی کے پروفیسر تھے کہ سرسالار جنگ لکھنؤ آئے۔ ان کی مردم شناس نظر ان پر پڑی، تو انھیں حیدرآباد ساتھ بلوا لے گئے اور خورد سال میر محبوب علی خان نظامِ ششم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اس کے بعد یہ ریاست حیدرآباد میں متعدد موقّر عہدوں پر فائز رہے۔ وزیرِ ہند کی کونسل کے رکن مقرر ہو کر لندن گئے لیکن وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی اور تین سال بعد ہندستان واپس چلے آئے۔ یہ انگریزی پر ماہرانہ قدرت ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ لیکن افسوس کہ آنکھوں میں پانی اتر آیا اور بینائی سے معذور ہو گئے اور یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ سترہ پاروں کا ترجمہ، چھپا ہوا، ان کے خاندان میں موجود ہے۔ وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ میرا کتب خانہ آصفیہ لائبریری اور عثمانیہ یونیورسٹی کو دے دیا جائے۔ چنانچہ عربی اور فارسی کی کتابیں آصفیہ کے اور انگریزی کی عثمانیہ یونیورسٹی کے حصے میں آئیں۔ ۳ر جون ۱۹۲۶ء کو حیدرآباد میں انتقال ہوا۔[۹]

نواب عماد الملک کے دادا مولوی سید کرم حسین تھے۔ ان کا خاندان بلگرامی سادات کا ہے۔ وہ جدِّ قبیلہ سید عمر بن بدر الدین بدلے سے آٹھویں پشت میں تھے۔ ان کے والد کا نام سید حسین رضا تھا۔ مولوی کرم حسین کو عربی اور فارسی میں عالمانہ دستگاہ حاصل تھی۔ جس زمانے میں غالب کلکتے گئے ہیں، یہ وہاں شاہِ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں سفیر تھے۔ وہ سرکارِ اودھ کی طرف سے خطاب خان بہادر اور خلعت مع اسپ وفیل و پالکی و نالکی کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔ زمانۂ سفارت میں سترہ سو روپیہ مشاہرہ ملتا تھا۔ مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے بھی تعلق تھا اور یہاں وہ غالباً عربی کا درس دیتے تھے۔ قیامِ کلکتہ کے دوران میں انگریزی بھی سیکھ

۹۔ ان کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: عمادیہ مرتبہ حکیم شمس اللہ قادری

لی تھی اور کسی قانونی کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ بلگرام میں یہ پہلے شخص تھے، جنھوں نے انگریزی سیکھی[10]۔

کلکتہ میں کپتان بنسن مولوی کرم حسین کے بڑے مربّی اور خیر خواہ تھے۔ گورنر جنرل کے ہاں بھی ان کا بہت رسوخ تھا۔ ان کا تبادلہ ہوگیا اور وہ ولایت چلے گئے۔ اب سرکارِ اودھ کے مخالفوں کے لیے میدان خالی ہوگیا۔ مسٹر جان لو ریذیڈنٹ مدت سے خار کھائے بیٹھا تھا اور شاہِ اودھ کی حیثیت کم کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ بنسن کے جانے کے بعد اس نے گورنر جنرل کے سامنے تجویز پیش کی کہ سفیرِ اودھ کا عہدہ موقوف کر دینا مناسب ہے۔ گورنر جنرل نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور مولوی کرم حسین کی سفارت ختم ہوگئی[11]۔ لیکن یہ اس کے بعد بھی کلکتے ہی میں مقیم رہے۔ وہیں ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا، اور وہیں دفن ہوے[12]۔

سید کرم حسین کا اپنے علم و فضل اور دنیوی وجاہت کے باعث کلکتے کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ غالب کی ان سے ملاقات مولوی سراج الدین احمد کے ذریعے سے ہوئی ہو۔ نسّاخ کی بھی سید کرم حسین سے ملاقات تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اپنے مکان پر اکثر مشاعرے کرتے رہتے تھے، جن میں مقامی ایرانی حضرات شامل ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں غالب نے اپنی وہ غزل سنائی تھی جس کا مطلع ہے:

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

لیکن اگر یہ غزل کلکتے میں کہی گئی تھی، تو تعجب ہے کہ انھوں نے اس کا کوئی شعر گل رعنا میں نہیں لیا۔

۱۰۔ وصی الحسن بلگرامی، روضۃ الکرام شجرہ سادات بلگرام : ۱۵۴

۱۱۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ : ۴ : ۳۲۸

۱۲۔ روضۃ الکرام : ۱۵۴

بہر حال یہ واقع ہے کہ رفتہ رفتہ مولوی کرم حسین سے غالب کے تعلقات بہت دوستانہ ہو گئے تھے۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں[13]:

> اور وہ جو فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ــــــ یہ بحر ہے، اوس میں ایک میرا قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے؛ انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی۔ بہت پاکیزہ اور بے ریشہ ۔ اپنے کف دست پر رکھ مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ کہہ کر اون کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اون سے لی۔

غالب نے یہ واقعہ اجمالاً بیان کیا ہے؛ اس کی تفصیل مولانا حالی کے وہاں ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں[14]:

> ۱۲۷۱ھ میں جب کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے، مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے، اور میں بھی حاضر تھا، شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا: فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں، ویسا نہیں ہے۔ اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا، اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے: اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں، تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا، جو ان کے دیوانِ ریختہ میں موجود ہے۔

۱۳۔ خطوطِ غالب (مرتبہ مالک رام): ۳۵۸ ۱۴۔ یادگارِ غالب: ۵۱

اس سے کھلا کہ بات اس طرح شروع ہوئی کہ سید کرم حسین بلگرامی نے فیضی کی تعریف کی تھی؛ فیضی سے متعلق غالب نے اس رائے کا بعد کے زمانے میں بھی کئی مرتبہ اظہار کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندستانی ادیبوں میں سے وہ امیر خسرو کے سوائے کسی کے بھی غیر مشروط طور پر قائل نہیں تھے؛ اور اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ رائے بہت قدیم سے تھی۔

یہاں جس قطعے کا ذکر ہے، وہ چکنی ڈلی کے عنوان سے دیوان اردو میں شامل ہے۔ غالب نے کہا ہے کہ اس میں نو دس شعر ہیں؛ اور مولوی محمد عالم کے نزدیک ان کی تعداد گیارہ ہے۔ اس وقت اس میں تیرہ شعر ملتے ہیں۔ اس کا پہلا شعر ہے :

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے

گویا مصرعِ اولیٰ میں 'صاحب' سے مراد سید کرم حسین بلگرامی ہیں۔

غالب نے جب کلکتے میں حامیانِ قتیل کے جواب میں مثنوی بادِ مخالف (جس کا نام اس وقت آشتی نامہ تھا) لکھی ہے، تو منجملہ اور احباب کے اس کی ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی کے پاس بھی بھیجی تھی [۱۵]

مجھے یقین ہے کہ جب غالب نے گل رعنا مرتب کی ہے، تو مولوی کرم حسین نے انھی ایام میں اس کی نقل حاصل کر لی ہوگی۔ اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نسخہ انھوں نے خود تیار کروایا تھا؛ غالب نے اسے لکھوا کر ان کی نذر نہیں کیا تھا۔ اس نسخے میں بعض جگہ بیاض ملتی ہے۔ اگر اسے غالب نے پیش کیا ہوتا، تو یہ ممکن نہیں تھا؛ وہ بآسانی یہ مقامات مکمل کروا سکتے تھے۔ ان جگہوں پر بیاض کا رہ جانا ظاہر کرتا ہے کہ کاتب منقول عنہ نسخے میں مصرع ٹھیک سے پڑھ نہیں سکا، اس نے جگہ خالی چھوڑ دی۔ وہ یقیناً اسے مکمل کرنا چاہتا ہوگا، جس کی اسے

۱۵- عود ہندی : ۱۵

فرصت نہ ملی۔ یقین سے کچھ کہنا تو ممکن نہیں، لیکن قوی امکان ہے کہ منقول عنہ نسخہ خود غالب ہی کا لکھا ہوا ہو۔

یہ نسخہ مولوی کرم حسین کے خاندان میں رہا اور نسلاً بعد نسلٍ سید مہدی حسین (مہدی یار جنگ) کو ملا۔ انھوں نے اسے اپنے بھتیجے جناب سید نقی بلگرامی کو عطا کیا اور انھوں نے اسے مجھے مرحمت فرما دیا۔

میراثِ جم کہ مے بود، اینک بمن سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم ست

۴

گل رعنا کا یہ نسخہ مکمل ہے۔ کاغذ کا سائز ۲۴½ × ۱۴ سم ہے، اور حوض کا ۱۹½ × ۹¾ سم۔ کاغذ باریک، ولایتی، ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے آثار ملتے ہیں، لیکن اس سے نہ کتاب کو کوئی نقصان پہنچا ہے، نہ متن ہی کا کوئی حصہ ضائع ہوا ہے۔ پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں، سیاہ روشنائی سے، نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے۔ کاتب اگرچہ بہت خوشخط تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن بد خط بھی نہیں ہے۔ غلطی بھی کم کرتا ہے، اگرچہ اس سے بالکل عاری نہیں ہے۔ ہر جگہ تخلص، عنوان، ولہ وغیرہ الفاظ شنجرفی روشنائی سے لکھے ہیں۔ ہر ایک صفحے پر دو جدولیں ہیں۔ باہری جدول صفحے کے کنارے سے کچھ ہی اندر کی طرف اکہرے نیلے خط کی ہے۔ اس سے تین سم اندر حوض کے عین اردگرد جدول تین خطوں پر مشتمل ہے ــ باہر نیلا خط ہے، اور اندر کی طرف شنجرفی رنگ کے دو خط۔ غزلوں کے درمیان کے خطوط بھی شنجرفی ہیں۔ غرض کہ کتاب اچھے خاصے اہتمام سے لکھی گئی ہے۔

ہر ایک صفحے پر تیرہ سطریں ہیں۔ صفحہ ایک خالی ہے؛ کتاب صفحہ ۲ سے شروع ہوتی ہے اور اس پر نمبر شمار (۱) درج ہے۔ پوری کتاب ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

ص ا سے فارسی دیباچہ شروع ہوتا ہے، اس کے عنوان میں صرف یہ لفظ لکھے ہیں:
لاموثر فی الوجود الااللہ۔ یہ ص ۷ تک چلا گیا ہے۔ اس کے آخر میں تاریخ نامکمل ہے۔ لکھا ہے:
محررۂ نہم شوال ۱۲ ہجری۔ اب گلِ رعنا کا غالب کا اپنا لکھا ہوا نسخہ بھی لاہور میں دستیاب ہو گیا
ہے، جس کے آخر میں تاریخ "غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ" ثبت ہے، جو مطابق ہے ۱۱ ستمبر
۱۸۲۸ء کے۔ گویا غالب نے اسے اپنے کلکتے میں ورود کے تقریباً آٹھ مہینے بعد مکمل کیا۔ میرے
خیال میں نسخۂ زیرِ نظر کے کاتب نے دیباچے کے آخر میں وہ تاریخ دینا چاہی تھی، جب اس
نے اسے نقل کیا ہے، نہ کہ نسخہ منقول عنہ کی تاریخ (جو میرے نزدیک خود غالب کا لکھا ہوا
نسخہ تھا)۔ اگر میرا قیاس درست ہو، تو یہ زیرِ نظر نسخہ شوال ۱۲۴۴ھ کا کتابت کردہ ہے۔ سالِ
تحریر کی عدم تکمیل غالباً نتیجہ ہے، کاتب کے سالِ ہجری سے ناواقفیت کا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے
بعد کو مکمل کرلے، لیکن اس کا اسے موقع نہ ملا۔ ۱۲ کا لکھنا اور بقیہ خالی چھوڑ دینے کی اور
کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک اور امر کی طرف اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس قلمی نسخے کے خاتمے کی نثر کے اختتام پر کاتب نے "محرر اسد اللہ محررۂ دوم محرم الحرام"
کے الفاظ کے بعد جلی عنوان دیا ہے: خاتمہ دیوانِ فارسی۔ لیکن خاتمۂ دیوان فارسی کی عبارت
اس کے بعد لکھی نہیں گئی۔ اس وقت مطبوعہ کلیات نثر میں "خاتمۂ گل رعنا" کی عبارت کے خاتمے
کی واقعی یہی صورت ہے۔ اس سے شبہہ ہو سکتا ہے کہ کاتب نے شاید یہ عبارت گلِ رعنا کے
اصلی خطی نسخے سے نہیں، بلکہ کلیاتِ نثر کے کسی قلمی نسخے سے نقل کی ہو۔ یہ قیاس درست نہیں ہوگا،
کیونکہ گل رعنا کا متنِ انتخابِ اشعار کلیاتِ نثر کے کسی نسخے میں نہیں ملتا۔ ایک بعید سا امکان
یہ ہے کہ متنِ اشعار تو اس نے واقعی گلِ رعنا ہی سے لیا، اور خاتمے کی عبارت کلیاتِ نثر
کے کسی خطی یا مطبوعہ نسخے سے نقل کی؛ اور رَوارَوی میں 'خاتمہ دیوان فارسی' الفاظ بھی لکھ گیا، تو یہ
بات بھی ماننے کی نہیں۔ آخر جب اس نے متن گل رعنا سے لیا تھا، تو نثری حصہ بھی کیوں نادر سے نقل کرلیا!

۵

خطی نسخے کے ص ۸ سے اُردو حصۂ انتخاب شروع ہوتا ہے اور یہ ص ۲۴ تک چلا گیا ہے۔ آخری پانچ شعر (درباں کیے ہوئے، طوفاں کیے ہوئے) اس صفحے پر پہلی چھ سطروں میں درج ہیں اور اس کے بعد فارسی نثر اور فارسی انتخاب شروع ہو جاتا ہے۔

اُردو انتخاب ۱۱۶ غزلوں سے لیا گیا ہے اور اس میں تبفصیلِ ذیل کل ۴۵۵ شعر ملتے ہیں:

ردیف	تعدادِ غزلیات	تعدادِ اشعار
الف	۲۹	۱۱۳
ب	۱	۷
ت	۱	۵
ث	۱	۱
ج	۱	۳
د	۱	۴
ر	۲	۶
ز	۲	۵
س	۱	۵
ش	۱	۲
ع	۱	۳
غ	۱	۲

ردیف	تعدادِ غزلیات	تعدادِ اشعار
ف	۱	۴
ک	۲	۶
گ	۱	۲
ل	۱	۳
م	۱	۳
ن	۱۵	۶۷
و	۲	۱۷
ہ	۱	۴
ی	۵۰	۱۹۳
میزان	۱۱۶	۴۵۵

اس پورے انتخاب کی ترتیب حروفِ تہجی کے مطابق ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی ردیف وار مرتب دیوان سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ اور یہ صحیح بھی ہے۔ ہمیں اس وقت تک گلِ رعنا سے پہلے کے کم از کم پانچ مجموعوں کا علم ہے، اور ان میں سے تین دستیاب بھی ہو چکے ہیں۔ ان میں سے دو تو بھوپال سے ملے ہیں: پہلا وہ جو نسخۂ حمیدیہ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (۱۹۲۱ء) اور دوسرا اس سے پہلے کا ابھی پار سال ملا ہے اور از اوّل تا آخر خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ تیسرا نسخہ کسی زمانے میں پروفیسر محمود خان شیرانی کی ملکیت میں ہونے کے باعث نسخۂ شیرانی کہلاتا ہے اور آج کل پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے کتابخانے کی زینت ہے۔ یہ بھی شائع ہو گیا ہے (۱۹۶۹ء)۔ یہ تین نسخے مل چکے ہیں (اور ان سے متعلق نسبتہً تفصیل سے آگے لکھ رہا ہوں)۔ ان کے علاوہ دو نسخے اور ہمارے علم میں ہیں۔ پہلا تو اس بیاض پر مشتمل ہوگا، جس سے غالب نے اپنا متذکرہ صدر دستخطی نسخہ نقل کیا تھا۔ اور ایک

وہ مجموعہ جو کلکتے میں ان کے پاس تھا اور جس سے گل رعنا کا انتخاب تیار کیا گیا۔

کلکتے کے دورانِ قیام میں غالب کے پاس اپنے اُردو کلام کا ایک مجموعہ تھا، جس کی شہادت خود ان کے ایک خط میں موجود ہے[16]۔ جب یہ وہاں پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں پہنچے، تو کسی مخالف نے انگریزی دفتر میں یہ شگوفہ چھوڑا کہ اس شخص نے اپنا نام اور تخلص تک تبدیل کر رکھا ہے، (اور خدا معلوم یہ کون ہے) اس پر سرکاری کارپردازوں کو ان کے نام اور شخصیت سے متعلق کچھ تامل اور شبہہ ہوا، تو غالب نے اپنے دیوانِ اُردو کا خطی نسخہ بطور شہادت پیش کیا، جسے وہ زاید از ہفت سال قبل (یعنی تقریباً ۱۸۲۱ء میں) لکھوا چکے تھے؛ اور جس کے آخر میں ان کی اسمی مہر "اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ" بھی ثبت تھی، جس میں تاریخ ۱۲۳۱ھ کندہ ہے۔ خدا خدا کر کے، اس سے حکام کو اطمینان ہوا۔ اس خطی نسخے کا ہنوز کوئی سراغ نہیں ملا۔ گل رعنا کے اُردو کلام کا انتخاب قریب بیقین، اسی سے لیا گیا تھا۔

۶

اُردو دیوان کے برعکس سفرِ کلکتہ کے زمانے تک فارسی کلام نہ صرف مرتب نہیں ہوا تھا، بہ مقدار میں بھی بہت کم تھا۔ اگرچہ انھوں نے فارسی میں بھی اُردو کے ساتھ ہی شعرگوئی شروع کی تھی، بلکہ ممکن ہے کہ اس سے بھی قبل کی ہو۔ روایت ہے کہ انھوں نے طالبعلمی کے زمانے میں ایک غزل کہی تھی، جس میں ردیف 'کہ چہ' بمعنی 'یعنی چہ' استعمال کی تھی۔ جب ان کے استاد مولوی محمد معظم نے اسے سنا، تو کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے۔ استاد کے اعتراض سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک 'کہ چہ' کا ان معنوں میں استعمال درست نہیں ہے۔ غالب کو اس کا خیال رہا۔ حسنِ اتفاق سے چند دن بعد جب وہ کلامِ ظہوری دیکھ رہے تھے، انھیں اس میں اس استعمال کی سند مل گئی۔ جب انھوں نے یہ مولوی محمد معظم کو دکھائی، تو نہ صرف ان کا اطمینان ہو گیا، بلکہ وہ اپنے ہونہار شاگرد کی خداداد ذہانت اور جودتِ طبع کے بھی قائل ہو گئے[17]۔

۱۶۔ نامہ ہائے فارسی غالب (مرتبہ سید اکبر علی ترمذی): ۱۰۲ (ضمیمہ ۱)

۱۷۔ ذکرِ غالب: ۳۴

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھیں فارسی سے زیادہ مزاولت نہیں رہی۔ بھوپال کے نودریافت خطی نسخہ' دیوان اردو میں لے دے کے فارسی کی ۱۳ رباعیاں ملتی ہیں، غزل ایک بھی نہیں ہے۔ یہی کہا جائیگا کہ اس نسخے کی کتابت (۱۲۳۱ھ) تک ان کا بس اتنا ہی فارسی کلام تھا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ اگر کچھ اور بھی ہوتا، تو وہ اسے بھی ضرور شامل کر لیتے۔

نسخہ' حمیدیہ اس سے بعد کی چیز ہے (کتابت، ۱۲۳۷ھ) اس کے آغاز ہی میں ایک طویل فارسی قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں ملتا ہے، جس کا مطلع ہے:

بہرِ ترویجِ جنابِ والیِ یوم الحساب
ضامنِ تعمیرِ قصرستانِ دلہاے خراب

اس کے بعد اثناے سفرِ کلکتہ میں انھوں نے فارسی کی طرف کچھ توجہ کی۔ مثنوی 'چراغِ دیر' قیامِ بنارس کی یادگار ہے۔ لیکن واقع یہی ہے کہ ہنوز وہ حدِ تفنّن سے متجاوز نہیں ہوئے تھے، اور بنیادی طور پر اُردو ہی کے شاعر تھے۔ کلکتے میں ایک تو یوں ہی اُردو کی بہ نسبت فارسی کا زیادہ چلن تھا۔ پھر ان کے احباب اور ملنے والوں میں بھی غالباً زیادہ لوگ فارسی داں ہی تھے۔ ان سے میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فارسی شعر گوئی کی وہ صلاحیت جو مدت سے خفتہ تھی، پھر سے بیدار ہو گئی۔ اب وہ باقاعدگی سے فارسی میں شعر کہنے لگے۔ اس وقت تک نہ انھوں نے فارسی کلام بین الدفتین جمع کیا تھا، جیسا کہ گلِ رعنا کے فارسی انتخاب کے شروع میں صراحت کی ہے، نہ بظاہر اس کی مقدار ہی قابلِ لحاظ تھی۔ اب پہلی مرتبہ انھوں نے اس کے لیے بیاض تیار کی۔ اور جب مولوی سراج الدین احمد نے ان سے انتخاب کی فرمایش کی، تو انھوں نے اُردو کلام کے ساتھ فارسی کلام بھی شامل کر لیا۔ فارسی حصے میں بھی شعروں کی تعداد اُردو حصے کی طرح ۴۵۵ ہی ہے، لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جہاں اُردو کلام ۱۱۶ غزلوں سے انتخاب کیا گیا ہے، فارسی میں یہ ۲۷ غزلوں سے لیا ہے، بلکہ حقیقتہً یہ انتخاب ہے ہی نہیں، بیشتر غزلیں پوری کی پوری شامل کر لی گئی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہاں ردیفوں کی ترتیب نہیں ملتی۔ اس سے

ظاہر ہے کہ یہ کسی بیاض سے نقل کی گئی ہیں، جہاں انھیں اولاً بلا لحاظِ ردیف انھوں نے لکھا ہوگا۔ فارسی شعروں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

صنف کلام		تعداد اشعار
قصیدہ	۱	۵۴
قطعہ	۲	۴۴
مثنوی	۱	۱۰۴
غزلیات	۲۷	

ردیف	تعداد غزلیات	اشعار	
الف	۶	۵۲	
ب	۱	۵	
ت	۴	۴۱	
د	۷	۶۸	
ر	۱	۱۱	
ز	۱	۱۰	
م	۲	۱۷	
ن	۳	۳۰	
ہ	۱	۱۰	
ی	۱	۹	۲۵۳
	۲۷		۴۵۵

فارسی انتخاب میں سب سے اول انڈریو اسٹرلنگ کی مدح میں قصیدہ ہے۔ غالب کو اسٹرلنگ کے عہدے سے متعلق کچھ غلط فہمی تھی۔ مرزا علی بخش خان کے خط میں انھوں نے

اسے 'اعیانِ کونسل' میں شمار کیا ہے: بظاہر اس سے مراد گورنر جنرل کی کونسل کا رکن ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ محمد علی خان، صدر امین باندہ کو انھوں نے "قوسِ عروجی کونسل را نقطۂ بدایت و قوسِ نزولی آن را نقطۂ نہایت" لکھا ہے۔ یہ کھینچ تان کر درست کہا جاسکتا ہے۔ دراصل وہ فارسی سکتر تھا۔ وہ فارسی خوب سمجھتا تھا اور ہندستانی لوگوں کی جملہ فارسی خط و کتابت اسی کے دفتر سے متعلق تھی۔ غالب نے یہ قصیدہ اسی لیے فارسی میں لکھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کسی انگریز کی مدح میں یہ ان کا پہلا قصیدہ ہے۔ اسٹرلنگ کا عین جوانی میں ۱۸۳۰ء میں انتقال ہوگیا؛ اس پر غالب نے تعزیتی قطعہ لکھا، جو دیوانِ فارسی میں موجود ہے (قطعہ ۴۵)

اس کے بعد کا فارسی قطعہ بھی کلکتے ہی میں کہا گیا تھا۔ اس میں اثنائے سفر کے مشہور مقامات — دلی، بنارس، سوہن، عظیم آباد کی تعریف کے بعد کلکتے سے متعلق سوال کرتے ہیں:

حالِ کلکتہ باز جستم، گفت: "باید اقلیمِ ہشتمش گفتن"

اس کے بعد ایک شعر ہے:

گفتم: 'اینجا چہ کار باید کرد' گفت: "قطع نظر ز شعر و سخن"

خیال ہوتا ہے کہ شاید اس شعر میں اس ادبی ہنگامے کی طرف اشارہ ہو، جس میں ان پر بسندِ قتیل اعتراض ہوا تھا۔ آخری تین شعروں کا مفاد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقدمے کے حسبِ منشا فیصلہ ہونے سے مایوس ہو چکے تھے:

گفتم: "از بہرِ داد آمدہ ام" گفت: "بگریز و سر بسنگ مزن"
گفتم: "اکنون مرا چہ زیبد؟" گفت: "آستین، بر دو عالم افشاندن"
گفتمش: "باز گو طریقِ نجات" گفت: "غالب! بکربلا رفتن"

دوسرا قطعہ جس میں تعلّی سے کام لیا ہے اور اپنی تائید میں شیخ علی حزیں کے دو شعر تضمین کیے ہیں، یہ بھی مخالفوں کے جواب میں ہے، اور اس کے صحیح مخاطب بھی کلکتے کے

معترضین ہیں۔ اس قطعے کا یہ شعر دیکھیے، جسے انھوں نے یہاں انتخاب میں نہیں لیا:

لیک ناید زمن کہ در گفتار
مدحت لالہ سور داس کنم

اس میں صریح اشارہ قتیل کی طرف ہے، جو نو مسلم تھا۔

مثنوی چراغِ دیر بنارس کی سرور انگیز فضا میں کہی گئی تھی۔ اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتا ہے کہ وہ اس جنت آباد کے ماحول سے مسحور اور یہاں کے پریزادوں سے بیحد خوش ہیں۔ یہ مثنوی دنیا کی عظیم نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اس میں ایک شہر اور ملک کی تہذیب و تمدن جس خوبی سے اور شگفتہ زبان میں بیان ہوئی ہے، اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آئی ہیں۔ پھر جس حسن اور رنگینی سے انھوں نے بنارس اور یہاں کے مہ جبینوں کی تصویر کشی کی ہے، وہ بجائے خود قابل دید ہے۔ لیکن اس تصویر میں حسن اور رنگینی آئی ہے، اس کی واقعیت سے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مثنوی میں بہت سے شعر آپ بیتی سے متعلق ہیں اور انھوں نے اس میں اپنے وارداتِ قلب بیان کیے ہیں۔ اس 'غارتگرِ ہوش' کو وہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی بھلا نہیں سکے، اور اسے یاد کرتے رہے ہیں۔ کلکتے میں کہی ہوئی ایک غزل کا مقطع ہے:

کاش، کان بتِ کاشی در پزیرد م، غالب!
"بندۂ توام" گویم؛ گویدم زناز: "آری"

یہ محض سخن گسترانہ بات نہیں، بلکہ اپنی رام کہانی ہے۔

ان تینوں نظموں کے علاوہ میرے نزدیک یہ غزلیں یقیناً کلکتے میں کہی گئی تھیں: ۳، ۴، ۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۶، ۲۷۔ غزل (۶) عظیم آباد میں کہی گئی تھی؛ اس کے مقطع میں اس کے جوار کی ندی سوہن کی تعریف کی ہے:

مرحبا سوہن و جان بخشی اش، غالب! خندہ بر گمرہیِ خضر و سکندر دارم

گویا ۴۵۵ میں سے ۳۵۲ اشعار تو یقیناً اس سفر کے دوران کا کلام ہے؛ بقیہ سے متعلق اگرچہ یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں، لیکن کیا عجب کہ وہ بھی اسی زمانے کا ہو۔

۷

میں نے گلِ رعنا کی ترتیب و تحشیہ میں مندرجۂ ذیل کتب استعمال کی ہیں:

۱۔ سب سے اول دیوان اردو کا وہ نسخہ ہے، جو کاملاً غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور ابھی پارسال اپریل میں بھوپال کے ایک کہنہ فروش سے ملا ہے۔ یہ ۱۹۶۹ء ہی میں پہلے رامپور سے شائع ہوا، پھر لاہور سے۔

اس بینظیر خطی نسخے کے ص ۴۱ (الف) پر حاشیے میں یہ اندراج ملتا ہے: لعل خان بتاریخ اول صفر ۱۲۳۵ درماہہ عبہ۔ ظاہرا یہ کسی شخص لعل خان کے ملازم رکھے جانے کی یادداشت ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ تحریر بھی غالب کے قلم سے ہے۔ مجھے اس میں شبہہ ہے۔ یہ غالب کے سوادِ خط سے مشابہ نہیں، اور اس میں بعض ایسی خصوصیتیں ملتی ہیں، جو غالب کی روش نہیں۔ بہرحال یہ غالب کی تحریر نہ ہو، جب بھی اس سے ایک بات تو ثابت ہی ہے کہ غالب اس خطی نسخے کی کتابت اس تاریخ سے قبل مکمل کر چکے تھے۔ اس نسخے کا ترقیمہ ہے:

> بتاریخِ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقیماندہ
>
> فقیرِ بیدل، اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر
>
> دیوانِ حسرت عنوانِ خود فراغت یافتہ ...... الخ

اس تحریر میں کسی وجہ سے سنہ ہجری کے ہندسے لکھنے سے رہ گئے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے تاریخ ماہ اور دن لکھے گئے ہیں۔ یکم صفر ۱۲۳۵ھ سے قبل جب مندرجۂ صدر یادداشت قلمبند کی گئی، ۱۴ رجب منگل کے دن، ۱۲۳۱ھ میں پڑتا ہے، اس لیے اس نسخے کی تاریخِ کتابت

یہ تسلیم کرلی گئی ہے۔ چونکہ غالب کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہے، اس سے ثابت ہوا کہ وہ ۱۹ سال کی عمر میں اپنا مکمل مردّف دیوان مرتب کرچکے تھے۔ اس نسخے میں ۲۴۰ غزلیں اور ۱۵۴۱ اشعر بنیادی متن میں اور ۱۲۲ اشعار پر مشتمل ۱۲ غزلیں حاشیے پر ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۳ فارسی رباعیاں اور ۱۱ اُردو رباعیاں بھی ہیں۔ گویا غزلوں اور رباعیوں کو ملاکر کل ۱۷۰۱ شعر۔ حاشیے کا کلام غالب کا نہیں، کسی اور شخص کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس نسخے کے بخطِ غالب ہونے کے باعث حواشی میں اس کے لیے حرف غ استعمال کیا ہے۔

۲۔ اس کے بعد وہ نسخہ ہے جو ۱۸۲۱ء میں لکھا گیا اور کسی زمانے میں بھوپال کے ایک رئیس اور حکمران خاندان کے فرد جناب فوجدار محمد خان کے کتب خانے میں تھا۔ ابھی سال بھر پہلے تک اُردو دیوان کا یہی قدیم ترین نسخہ تھا۔ محولہ صدر نسخے کی دریافت کے بعد یہ دوسرے نمبر پر آگیا ہے۔ اس کے مرتب مفتی محمد انوار الحق نے خطی نسخے کے کلام پر متداول دیوان کے کلام کا اضافہ کیا اور اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ اسے ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے شائع کردیا۔ چونکہ اس وقت نواب محمد حمید اللہ خان والیِ بھوپال، ولی عہد اور چیف سکرٹریاست تھے، اور یہ نسخہ ان کی سرپرستی میں شائع ہوا تھا، اس لیے اسے نسخۂ حمیدیہ کا نام دیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب یہ خطی نسخہ دستیاب ہوا ہے، علمی حلقوں میں سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ اہلِ نظر نے اس دیوان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی اشاعت سے غالب شناسی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ لیکن افسوس کہ مرتب اور ان کے ہمکاروں کی سہل انگاری سے اس میں کئی طرح کی غلطیاں راہ پاگئیں۔ ان میں سے دو بہت افسوسناک تھیں: متن اور حاشیے کا کلام کچھ ایسا گڈمڈ ہوگیا کہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کونسا کلام ۱۸۲۱ء سے پہلے کا ہے اور کونسا بعد کا۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف رسم الخط میں ترمیم کرکے اسے جدید بنا دیا، بلکہ اس میں کتابت کی تصحیح پر بھی کماحقہ توجہ نہیں دی گئی جس سے یہ نسخہ بیحد غلط چھپنے کے باعث ساقط الاعتبار ہوگیا۔ بدقسمتی سے اصلی خطی نسخہ بہت دن سے غائب ہوچکا ہے اور اب اس کے استفادے

کے امکانات نہیں رہے۔ خوش بختی سے مولانا امتیاز علی خان عرشی نے اپنا دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) مرتب کرنے سے پہلے اصلی نسخے کو ۱۹۳۶ء میں دیکھا تھا۔ یوں ان کے مرتبہ دیوان سے اغلاط کی بہت حد تک اصلاح ہوگئی۔ نسخۂ عرشی کا دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے، بلکہ اس کا متن کاملاً چھپ چکا ہے۔ انھوں نے میری درخواست پر یہ حصّہ میرے دیکھنے کو بھیج دیا جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

اس کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خان (لاہور) نے بھی ۱۹۳۸ء میں اصلی خطی نسخے کا معائنہ کیا تھا اور اپنے استفادے کے لیے اس سے یادداشتیں لے لی تھیں۔ انھوں نے صرف وہ کلام جو اصلی خطی نسخے میں تھا، اپنی یادداشتوں کی روشنی میں مرتب کر کے "دیوانِ غالب۔ نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع کر دیا ہے (لاہور جولائی ۱۹۶۹ء)۔

میں نے گل رعنا کے حواشی میں ان دونوں سے استفادہ کیا ہے اور نسخۂ حمیدیہ کی رعایت سے اس متن کو ح کے حرف سے ظاہر کیا ہے۔

۳۔ حافظ محمود خان شیرانی مرحوم (ف فروری ۱۹۴۶ء) کے پاس ایک قلمی نسخۂ دیوان تھا، جس میں نسخۂ حمیدیہ کے حواشی کا کلام بھی متن میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی کتابت نسخۂ حمیدیہ کے بعد ہوئی۔ یہ جس شخص کی بھی ملکیت رہا ہو، وہ لازماً غالب کا کوئی عزیز قریب تھا۔ کیونکہ جب وہ کلکتے گئے ہیں، تو اثنائے راہ کا کلام اس کے پاس بھیجتے رہے اور وہ اسے کاتب سے اس خطی نسخے کے حاشیے پر اضافہ کرواتا رہا۔ ان میں سے بعض غزلوں کے شروع میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسے یہ غزل کہاں سے موصول ہوئی۔ ان غزلوں کے مطلعے حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ص ۳ (ب)۔ ۴ (الف)۔ از باندہ فرستادند۔

ستایشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ ایک گلدستہ ہے، ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

۲۔ص ۴۳ (الف)۔ از باندہ رسید

آبرو کیا خاک اوس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

۳۔ص ۴۳ (الف و ب)

ذکر میرا بہ بدی بھی اوسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دور نہیں

۴۔ص ۴۳ (ب)

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

(یہ تینوں غزلیں مسلسل یکے بعد دیگرے لکھی ہیں اور صرف پہلی غزل کے شروع میں الفاظ، 'از باندہ رسید' ملتے ہیں۔ اگلی دونوں غزلوں کے شروع میں صرف لفظ غزل ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ غزل کہاں سے موصول ہوئی تھی۔ اس سے بہرحال یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ یہ تینوں غزلیں 'باندہ' سے آئی تھیں۔)

۵۔ص ۵۶ (الف)

وہاں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

(اس کے شروع میں بھی کسی مقام کا نام نہیں ہے۔ لیکن یہ غزل کبھی لکھنؤ میں گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ سے بھیج دی گئی ہو، یا باندہ پہنچنے کے بعد بھیجی ہو)

۶۔ص ۶۱ (الف)

ظلمتکدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
ایک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

۷۔ص ۶۱۔ (الف و ب)

کب سنے ہے وہ کہانی میری　　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

اس سے ان غزلوں کا زمانہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہ ۱۸۲۷ء میں کہی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ خطی نسخہ خود غالب کا بھی دیکھا ہوا ہے۔ اس کے ص ۹ (الف) کے حاشیے میں غالب کے قلم سے وہ غزل لکھی ملتی ہے، جس کا مطلع ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!　　　نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا!

اس کے علاوہ پورے دیوان میں ان کے ہاتھ کی اصلاحیں ہیں، جو انھوں نے کاتب کی غلط نویسی کے سلسلے میں کی ہیں۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا، تو تیرہ مختلف مقامات پر غالب کی تحریریں ملیں۔ افسوس کہ یہ خطی نسخہ دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں ناقص ہو گیا ہے۔ درمیان میں دو جگہ سے (ص ۱۹ (ب) کے بعد اور ۱۰۶ (ب) کے بعد) کچھ حصہ ساقط ہو گیا ہے۔ آخر سے بھی ضرور کچھ صفحات غائب ہو گئے ہیں۔ اسی لیے اس نسخے میں کوئی ترقیمہ نہیں ملتا۔ یہ نسخہ آفسٹ عکس میں لاہور سے شائع ہو گیا ہے (۱۹۶۹ء)۔

میں نے حواشی میں اس نسخے کی نشاندہی شیرانی مرحوم کے نام کی مناسبت سے حرف ش سے کی ہے۔

۴۔ اس وقت متداول دیوانِ اُردو کا متن جائز طور پر اس ایڈیشن پر مبنی ہے، جو غالب کی زندگی میں ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی، کانپور میں چھپا تھا۔ صحیح معنوں میں یہی اُردو کلام کا آخری ایڈیشن ہے، جو ان کی نظر سے گذرا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ دیوان پھر ایک مرتبہ ۱۸۶۳ء میں بھی آگرے میں چھپا، لیکن یہ ان کے ایک پرانے نسخے کی نقل تھا۔ کلام کی آخری شکل معلوم کرنے کے لیے مطبع نظامی کا نسخہ ناگزیر ہے۔ یہی میں نے کیا ہے؛ اس کے لیے حرف ن استعمال کیا گیا ہے۔

۵۔ غالب کی خوش قسمتی میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے کہ اس کے صدی سال میں دو ایسی چیزیں پہلی بار

منظرِ عام پر آئیں جو سرتاسر خود اس کے قلم سے لکھی گئی تھیں۔ پہلا دیوان اُردو جس کا اوپر ذکر ہوا؛ اور دوسرا گُلِ رعنا کا نسخہ۔ آخر الذکر لاہور میں جناب خواجہ محمد حسن کے ہاں سے نکلا اور انھیں یہ اپنے نانا خواجہ احمد اللہ مرحوم امرتسری سے ورثے میں ملا تھا۔

حُسنِ اتفاق سے اس کے متن کے مطبوعہ صفحات مجھے اس کتاب کے مطبعے میں بھیجے جانے سے پہلے دیکھنے کو مل گئے۔ چنانچہ حواشی میں جہاں حرف ل ہے، اس سے یہی قلمی نسخہ لاہور کے مطبوعہ صفحات مراد ہیں۔

۶۔ کلیات نثر فارسی جس میں غالب کی تین نثری کتابیں (پنج آہنگ، مہر نیمروز، دستنبو) شامل ہیں، ۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور، لکھنؤ میں چھپی تھی۔ چونکہ آخری مرتبہ انھوں نے پنج آہنگ کے متن پر اس ایڈیشن سے پہلے نظر ڈالی تھی، اس لیے گُلِ رعنا کے دیباچے اور خاتمے کی فارسی عبارتوں کے لیے میں نے کلیات کے متن کو ترجیح دی ہے، اور اس کے لیے حرف ک استعمال کیا ہے۔ البتہ یہ اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ مطبوعہ نسخے کی بجائے اس کا قلمی اصل میرے پیشِ نظر رہا ہے۔

۷۔ فارسی انتخاب کے حواشی کے لیے غالب کے دیوان فارسی کے قدیم ترین خطی نسخے کا عکس میرے سامنے رہا ہے۔ یہ نسخۂ دیوان ۱۲۵۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے ذاتی کتابخانے میں محفوظ تھا؛ اور اب غالباً انجمن ترقی اُردو، کراچی کی تحویل میں ہے۔ اس کا عکس میرے ذاتی ذخیرے میں موجود ہے۔

چونکہ یہ کراچی میں دستیاب ہوا، اس لیے میں نے اس کے لیے نشان کچ استعمال کیا ہے۔

۸۔ فارسی دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ء میں دلّی سے شائع ہوا تھا۔ طا سے مراد یہی طبعِ اول کا نسخہ ہے۔

۹۔ دوسری مرتبہ یہ مطبع نولکشور، لکھنؤ میں ۱۸۶۳ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ طب سے اسی طبعِ ثانی کی طرف اشارہ ہے۔

۸

یہ مسئلہ بہت دن زیرِ بحث رہا ہے کہ میرزا نے اپنا قدیم تخلص اسد کب ترک کیا اور غالب کب اختیار کیا۔ نو دریافت خطی نسخۂ دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم اس کی کتابت (۱۲۳۱ھ) تک وہ صرف اسد تخلص کرتے تھے کیونکہ اس کے ترقیمے میں انھوں نے اپنا نام 'اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد' لکھا ہے۔ اس کے بعد نسخۂ حمیدیہ والے خطی نسخے کے ترقیمے میں دونوں تخلص یکجا ملتے ہیں۔ اس کے الفاظ ہیں:

دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب

حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر، ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ صورتِ اتمام یافت

یہ اس نسخے کی کتابت کی تاریخ ہے؛ اور خدا معلوم' اس سے قبل کب سے وہ غالب تخلص لکھ رہے تھے۔ لیکن یہ تو دیوان کے نسخۂ نو دریافت (غ) ہی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے ۱۲۳۱ ھ (سالِ کتابتِ نسخہ) کے بہت زمانہ بعد نیا تخلص اختیار نہیں کیا کیونکہ غ کے متن میں ہر جگہ مقطع میں تخلص اسد استعمال ہوا ہے، لیکن کئی جگہ انھوں نے مصرع بدل کر اس کی بجائے دوسرا مصرع لکھ دیا ہے، جس میں تخلص اسد کی جگہ غالب ملتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ غیروں سے' اسد! گرمِ سخن دیکھ کے اوس کو (کی جگہ) غیروں سے اوسے گرمِ سخن دیکھ کے' غالب!

۲۔ برتر ہے رتبہ فہمِ تصوّر سے بھی' اسد! (″) غالب! ہے رتبہ فہمِ تصوّر سے کچھ پرے

۳۔ خدایا! اس قدر بزمِ اسد گرمِ تماشا ہو (″) خدایا! بزمِ غالب اس قدر گرمِ تماشا ہو

۴۔ چھپاؤں کیونکہ سوزش' اے اسد! داغِ نمایاں کی (″) چھپاؤں کیونکہ غالب! سوزشیں داغِ نمایاں کی

۵۔ اسد! وہ گل کرے جس گلستاں میں جلوہ فرمائی (″) وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے' غالب!

۶۔ اسد! محفل میں میری گردشِ افلاک باقی ہے (″) میری محفل میں' غالب! گردشِ افلاک باقی ہے

۷۔ بزمِ ہستی وہ تماشا گاہ ہے جس کو' اسد! (″) بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ' غالب! ہم جسے

۸۔ آئے ہیں' اسد! ہم رہِ اقلیمِ عدم سے (″) ہم آئے ہیں' غالب! رہِ اقلیمِ عدم سے

بہر حال اس میں کسی طرح کا شبہہ نہیں کہ وہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء اور ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء کے درمیانی زمانے ہی میں کسی وقت اسد کے ساتھ غالب تخلص بھی لکھنے لگے تھے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی بےمحل نہیں ہوگا:

غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں تیار کروائی تھیں: اسداللہ خان عرف میرزا نوشہ اور اسداللہ الغالب۔ بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ 'اسداللہ الغالب' مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سال (۱۲۳۱ھ میں) غالب تخلص اختیار کیا۔ حال آنکہ نہ ان کا نام اسداللہ تھا، نہ تخلص الغالب۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس مہر میں لفظ غالب بطورِ تخلص استعمال ہی نہیں ہوا، بلکہ یہ مہر انھوں نے بطور سجع تیار کروائی تھی۔ دراصل 'اسداللہ الغالب' لقب ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا۔ چونکہ میرزا کا نام اسداللہ خان تھا، اور وہ عقیدے کے لحاظ سے شیعی تھے، اس لیے انھوں نے یہ سجع والی مہر بنوا کر گویا حضرت علی سے اپنی عقیدت کا اعلان بھی کر دیا۔ غرض اس مہر سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۲۳۱ھ میں انھوں نے غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔

البتہ یہ درست ہے کہ بعد کو انھوں نے اسد تخلص سے بیزار ہو کر نیا تخلص رکھنے کا فیصلہ کیا، تو اسی سجع نے ان کی مشکل حل کر دی اور انھوں نے یہ سامنے کا لفظ بطور تخلص اختیار کر لیا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے[۱۸]:

> سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا؛ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب کہ فاضلِ بےعدیل تھے، ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت میں سرشتہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خان عرف مرزا خانی صاحب کوتوالِ شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے؛ نظم، نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے، ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر

۱۸۔ آب حیات: ۵۱۷

غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا، تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئینگے۔
مرزا نے کہا: اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے؟ انھوں نے کہا: خیر، ہوا سو ہوا؛ انتخاب
کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر
انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے، جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

یہ محض افسانہ طرازی ہے اور اس سے مقصود سوائے غالب کی نااہلی اور کج فہمی ثابت کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ مولوی فضل حق فاضلِ دینیات اور امامِ معقولات تھے، جس کی طرف خود آزاد نے 'فاضل بیعدیل' کے لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔ مراد یہ کہ وہ عالم ہونگے، انھیں شعر و سخن سے کیا واسطہ! رہے مرزا خانی، تو وہ نظم و نثر فارسی خوب لکھتے ہونگے، انھیں اُردو سے کیا سروکار! اور اس پر ٹھہرے قتیل کے شاگرد، اور قتیل سے متعلق غالب کی جو رائے تھی، وہ کس کے علم میں نہیں! آزاد نے ایک اور جگہ مرزا خانی سے متعلق جو واقعہ لکھا ہے، اس سے ان کی اپنی رائے مرزا خانی کی سخن فہمی اور سخن سنجی سے متعلق ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں[19]:

استادِ مرحوم (ذوق) نے فرمایا کہ ان دنوں مرزا خان کوتوال تھے، مرزا قتیل کے شاگرد؛ فارسی نگاری اور انشا پردازی کے ساتھ سخن فہمی کے دعوے رکھتے تھے۔ منشی محمد حسن خان میر منشی تھے اور فی الحقیقت نہایت خوش صحبت، خوش اخلاق، بامروت بزرگ تھے۔ ایک دن دونوں صاحب الٰہی بخش خان مرحوم کی ملاقات کو آئے اور تعارفِ رسمی کے بعد شعر کی فرمایش کی۔ انھیں اور لوگوں کی طرح یہ عادت نہ تھی کہ خواہ مخواہ جو آئے، اسے اپنے شعر سنانے لگیں۔ اگر کوئی فرمایش کرتا تھا، تو بات کو ٹال کر پہلے اس کا کلام سن لیتے تھے۔ شاعر نہ ہوتا، تو کہتے: کسی اور استاد کے دو چار شعر پڑھیے، جو آپ کو پسند ہوں۔ جب اس کی طبیعت معلوم کر لیتے، تو اسی رنگ کا شعر اپنے شعروں سے سناتے۔ اسی بنیاد پر ان سے کہا کہ آپ دونوں صاحب کچھ کچھ اشعار سنائیے۔ انھوں نے کچھ شعر پڑھے۔ بعد اس کے الٰہی بخش خان مرحوم نے دو تین شعر، وہ بھی ان کے اصرار سے، پڑھے؛ اور ادھر اُدھر

۱۹۔ آب حیات: ۴۵۱-۴۵۲

کی باتوں میں ٹال گئے۔ جب وہ چلے گئے، تو مجھ سے کہنے لگے: میاں ابراہیم! تم نے دیکھا، اور ان کے شعر بھی سنے، عجیب مجہول الکیفیت ہیں! کچھ حال ہی نہیں کھلتا کہ ہیں کیا! یہی مرزا خان اور منشی صاحب ہیں، جن کی سخن پردازی اور نکتہ یابی کی اتنی دھوم ہے۔ اور اس پر تماشبینی کے بھی دعوے ہیں! رنڈی ان کے منہ پر دو جوتیاں بھی نہ مارتی ہوگی۔ بھلا یہ کیا کہینگے اور کیا بھینگے!

اور ایسے شخص کے حوالے کر دیا غالب نے اپنا دیوان انتخاب کے لیے۔ آزاد کے سامنے دو باتیں تھیں۔ اول یہ کہ وہ بات جو ایک مولوی کی جسے شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور دوسرے قتیل کے شاگرد کی جسے وہ اس قدر حقارت سے یاد کرتے تھے، سمجھ میں آگئی، وہ غالب کو نہ سوجھی۔ اور دوسری بات اس سے بھی اہم یہ کہ یہ دیوان جسے "آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں" دوسروں کا مرہونِ منت ہے۔ اگر مولوی فضل حق اور مرزا خانی نے یہ کام نہ کیا ہوتا، تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی اسے پڑھنے تک کا روادار نہ ہوتا۔

غرض یہ افسانہ محض غالب کو مطعون کرنے کے لیے گڑھا گیا تھا۔ یوں تو غالب ساری عمر اپنے کلام میں سے خود ہی ترک و حذف کے اصول پر کاربند رہے، لیکن صحیح معنوں میں انتخاب کا کام انھوں نے پہلی مرتبہ کلکتے میں مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر کیا، جب یہ گلِ رعنا وجود میں آئی۔ اس کے دیکھنے کے بعد تو کسی شبہے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہ جاتی کہ متداول دیوان کا انتخاب بھی خود انھیں کا کیا ہوا ہے، اور اس میں کسی اور کا دخل نہیں تھا۔ گل رعنا کا جملہ انتخاب (چند مستثنیات سے قطع نظر) جوں کا توں متداول دیوان میں شامل ہے۔

بعض نقاد حضرات اس پر مصر ہیں کہ آغاز میں انھوں نے بیدل کی تقلید میں نہ صرف خیالات مشکل اور خیالی لکھے، بلکہ زبان بھی مشکل اختیار کی؛ اور انھیں اپنی اس غلط روش کا احساس نہیں تھا، یا شاید وہ آسان زبان لکھنے پر قادر نہیں تھے۔ رفتہ رفتہ آخری دور میں انھوں نے

میر کے زیرِ اثر آسان گوئی اختیار کی۔ نہ صرف یہ نظریہ غلط ہے، بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے غالب کے چار ایسے مجموعے ہیں، جو ۱۸۲۸ء تک مرتب ہو چکے تھے، جب ان کی عمر بمشکل ۳۰ سال کی تھی: غ (۱۸۱۶ء)، ح (۱۸۲۱ء)، ش (قبل ۱۸۲۶ء)، م (۱۸۲۸ء)۔

ان چاروں کے غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی وہ سب آسان غزلیں جن کی بنا پر انھیں میر کے زیرِ اثر کہا جاتا ہے، ان میں موجود ہیں۔ پس یہ خیال کرنا کہ مرورِ زمانہ سے انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ یہ اسلوب غلط ہے، جس کے نتیجے میں وہ مشکل نویسی سے تائب ہو گئے؛ اور یہ سب کچھ ان کی میر سے گرویدگی کے باعث ہوا، خود بخود غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

یہاں ان کی زیادہ مشہور آسان غزلوں پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا۔ مطلع کے سامنے قوسین میں ماخذ کے حوالے سے یہ مراد ہے کہ یہ غزل سب سے پہلے کس مجموعے میں ملتی ہے:

کہتے ہو نہ دینگے ہم، دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا (ح)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بیدوا پایا (ح)

دہر میں نقشِ وفا، وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا (ح)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا (ح)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمادینگے کیا! — زخم کے بھرتے تلک، ناخن نہ بڑھ آوینگے کیا! (حاشیۂ ح ش)

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا — عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا (ش)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا (حاشیۂ ش، م)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک (ح)

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں (غ)

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں (ح، حاشیۂ ح، ش)

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑینگے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن (ح)

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں — میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں (ح)

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں (ح)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز او ر وہ ماہ و سال کہاں (حاشیۂ غ، حاشیہ ح، ش)

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں (ش)

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں — یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں (ش)

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں — سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں (ش)

وارستہ اس سے ہیں، کہ محبت ہی کیوں نہ ہو — کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو (حاشیۂ غ، حاشیۂ ح)

کب سنے ہے وہ کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری (حاشیۂ ش، م)

چاہیے خوباں کو جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے (حاشیۂ غ، آخر ح، ش)

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی (حاشیۂ غ، ش)

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے (حاشیۂ غ، آخر ح، ش)

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — یارب! اسے لکھ دیجیو قسمت میں عدو کی (حاشیۂ غ)

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے (حاشیۂ غ، آخر ح، ش)

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے (حاشیۂ غ)

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے (حاشیۂ غ، ش)

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے — کیا ہوئی، ظالم! تری غفلت شعاری ہائے ہائے (حاشیۂ غ، ح)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے (حاشیۂ ح، ش)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے — میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے (آخر ح، ش)

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی، نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی (ح)

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے — ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے (آخر ح، ش)

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے — نالہ پابندِ نَے نہیں ہے (ش)

کبھی نیکی بھی اوس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے — جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے (آخر ح، ش)

آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے (ش)

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے — کہ اپنے سایہ سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے (ش)

کیا اتنی ساری غزلوں کو دیکھتے ہوئے یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ شروع میں آسان زبان لکھنے سے معذور تھے؟ ان غزلوں میں سے متعدد ۱۸۲۱ء (نسخۂ حمیدیہ کی تاریخِ کتابت) سے پیشتر کی ہیں، جب کہ ان کی عمر بمشکل ۲۴ برس کی تھی؛ اور بہت بڑی تعداد ۱۸۲۶ء سے قبل کی ہے، جو نسخۂ شیرانی کی آخری حد ہے۔ اس سے بعد کے کلام سے مندرجۂ ذیل غزلوں کو بھی آسان کہا جاسکتا ہے:

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

واقعہ یہ ہے کہ ان کی ابتدائی مشکل گوئی پسند کی نہیں، بلکہ مجبوری کی تھی۔ شعرگوئی کے آغاز میں وہ بیدل اور شوکت بخاری اور اسیر کی دور از کار خیالی شاعری اور تشبیہات و استعارات سے گرانبار طرزِ سخن سے گویا چکاچوند ہو گئے۔ نوجوانی کے زمانے میں جب جوش اور جذبات کا طوفان اپنے عروج پر ہوتا ہے، عقل و شعور رستے میں کیونکر حائل ہو سکتے تھے! بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابھی عقل و شعور کو موقع ہی کہاں ملتا تھا! ان اصحاب کی تقلید میں وہ بھی خیالی مضامین لکھنے لگے؛ اور انھیں ادا کرنے کو لامحالہ انھیں مشکل زبان لکھنا پڑی۔ لیکن اسی زمانے میں انھوں نے آسان غزلیں بھی لکھیں اور یہ وہ آخر تک لکھتے رہے، غرض نہ انھوں نے مشکل زبان بیدل کے زیرِ اثر لکھی، نہ آسان میر کے زیرِ اثر۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ان دونوں اثرات سے آزاد، حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت، مشکل بھی لکھ سکتے تھے اور آسان بھی۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشکل کلام میں تو کہیں کہیں انھوں نے بیراہروی

اور کوہ کندن و کاہ برآوردن کا ثبوت بھی دیا ہے، آسان میں وہ کہیں راہ راست سے نہیں بھٹکے ہیں۔

نئی دلی

۱۵ر فروری ۱۹۷۰ء

مالک رام

ترتیب

دیباچہ

لاموثر فی الوجود الا اللہ

خداوندا! نامیدی از رحمت در گناہم دلیر میکند۔ رگِ گردنِ جنونم را بزورِ بازوی نوازش بگسل و دل در مہرگانِ محرومی از تو سرد میگردد۔ بنای یائسم را آتشِ نازدہ فرو ہِل۔ آتشِ بیدادِ حالم برقِ خرمنِ مستقبل است، بداغِ دوزخ تاب بیجا صلیم مسوز و عمرم بتماشای بہارِ جاویدِ خرمِ جمالِ گزشتہ است، از تجلیاتِ جلالی چہرہ بہرِ عتابم مفروز۔ تمکینِ من از چرخِ بکسر بباد رفتہ دستخوشِ بازیِ سیارگانم مخواہ و دلم از ستم ظریفیِ روزگار آگفتہ نقشِ انجمنِ انجم مپسند۔ از تصور ہرچہ رفت خون در جگرم محاسبِ عمرم را بفرمای تا روزگارِ گزشتہ را در حساب ننہد۔ روی شاہدِ سعادت می نگرم۔ از آئینۂ زنگ بستہ زحل یک فلک کبودی بزدای، تا جلوۂ مشتری دہد۔ ناتوانی رنگِ عالم عالم نا امیدی میریزد۔ ہرچہ از تن کاست، بر جان بیفزای و گرمیِ اندیشہ شرر از پردۂ دل می پیزد، بر آبلۂ جگر بخشای۔

ای از تو نورِ اسپہدی از بالکانۂ دماغ بر سراپای دل تافتہ و مشتِ خاکِ تیرہ سرانجام از تو خردِ روشن و روانِ گویا یافتہ۔ چہ شگرف نوازش است خاکیانِ برشتہ جگر را زیرِ سایۂ نوای محمدی جا دادن و چہ سترگ بخشایش است بسلسلہ جنبانیِ شفاعتش درِ آمرزش بروی ما بستہ کاران گشادن۔ آفرینندۂ آفرین را بکام و زبان ستودن، اگر راست پرسی، خودنمایی است و ستودۂ جہان آفرین را ستایشگر بودن، اگر غلط نکنم، دعویِ خدائی۔ آبلہ پایانِ وادیِ تسلیم

سرِ مرا جبههٔ عبودیتی زیبد؛ گوهر آمای سجود و آیینه دارانِ حیرتِ جمالِ محمدی را قانون عقیدتی باید؛ زمزمهٔ ای درود۔

زلافِ حمد و نعت اولیٰ است[14] بر خاکِ ادب خفتن   سجودی میتوان کردن، درودی میتوان گفتن[15]

اما اگر کشش اختلاطِ بند[16] و آزادی، حیرانِ دو راههٔ اندوه و شادی، جهان جهان رنجِ تن را مطلوب و عالم عالم دردِ دل را طالب محمد اسد الله[17] (سمرقندی) المنشا[18]، اکبر آباد (ی) مولد، دهلی مسکن[19]: بساطِ دعویٰ ستایش ورنوردیدن طریقِ وادیِ نیایش زبانی از پردهٔ چاکِ جگر میرویاند و نارسا ناله دست از اثر بخونابِ دل شسته (را) بگوشِ یاران میرساند۔ فرارسندگانِ خوب و زشتِ سخن و دریابندگانِ نقص و کمالِ این فن نکو دانند که به آرایشِ بساطِ دعویٰ برنخاسته ام و در چارسوی سخن بخرده فروشی ننشسته۔ عمریست که سخنهای دلپذیر را بماتمِ دلهای سخن پذیر نشانده اند[20] و از سوادِ حرف و رقم مشتِ خاکی بر فرقِ لفظ و معنی افشانده۔ تماشائیانِ این باغ دربستهٔ جلوهٔ گل از رخنهٔ دیوارِ چمن می بینند و خرامندگانِ[21] این بهارستانِ گل از سایهٔ گل می چینند۔ اما هر که از سرخوشانِ بادهٔ مرد آزمای این انجمن است، از شیشه ریزه های بزمِ میکشانِ پاتانش[22] خارها در پیراهن است[23]۔ منت ایزد را که دلِ دانا و چشمِ بینا داده اند و زبانِ گویا[24] را جز بستایشِ یاران و نفرینِ خویش نگشاده۔ نه دلکش نوایم، نه هرزه خروش۔ نه تحسین خریدارم، نه شعر فروش[25]۔ بر گوشهٔ سماطِ لفظ ریزه چینِ و کاسه لیسِ گذشته جادو بیانانم[26] و بر طرفِ بساطِ معنی خواجه تاش و هم پیالهٔ آنانم[27]۔ چه اگر دیگران را از خزینهٔ جودِ مبداء فیاض لعل و گهر[28] بدامنِ فطرت می دهند، مرا نیز خرمهرهٔ چند در جیب و کنارِ اندیشه می نهند[29]۔

رسائیِ سعیِ فطرتم بنگر که هندی را از دهلی بسپاهان برده ام و نیروی سرپنجهٔ فکرم ببین که پارسی را از شیراز بهندوستان آورده[30]۔ هیهات[31] این چه گزاف است[32] در کسوتِ خودنمایی و این چه لاف است در صورتِ خویشتن ستایی! میتوان[33] گفت که خونِ آن دو زبانم به گردنست[34] و نعشِ آن دو ستم کشته ام بر دوش۔ چه یکی از پهلویِ من در وطن غریب گردیده و دیگری از شومیِ من وطن در غربت گزیده۔ کو خموشیی که هم انتقامِ آن دو بیزبان از من بستانند[35] و هم مرا از تفرقهٔ رد و قبولِ خلق[36]

وارهاند[37]. بیچمدانیِ من بدان پایه که اگر خود را بیچمدان گویمی، خرد از طنزِ بُرویم خندی، و تهمتِ دعویِ دانست بر من بندی.

اینقدر دانم که مرا از من پرداخته اند و رنگین کنِ افسانهٔ بیکسیهای خویشم ساخته. نفس باختهٔ حیرتم و جگر گداختهٔ وحشت. بیانم ضمیر آلا است[38] و داستانم جگر پالا، ناله ام از نشتر رخنه بجگر سپارنده تراست[39]، و نغمه ام از نوحهٔ دل بدرد آرنده تر. ستم کشیدهٔ[40] جانی دارم از وحشتِ تنهائیِ خویش آمادهٔ گریز. و دلی[41] سراپا از درد و داغِ دل لبریز. محوِ سرگرمیِ مذاقِ معینم، اگر دماغم پُر آتش است، چه عجب و نمک چشِ لذتِ حسنِ گلوسوزِ[42] گفتارم، اگر دهانم پُر آبست[43]، چه شگفت. آری، کوشش را میدان فراخ است و امید را سر رشته دراز. [44]بو که دلِ افسرده پارهٔ بدرد آید و لختی بخون شدن گراید. گرفتم، دل از دردِ نایافتِ دانش پژمانست و دیده از اندوهِ محرومیِ بینش نژند. من نیز از دل بآهی قانعم و از دیده باشکی خرسند.

ع   هر که قانع شد بخشک و تر شهِ بحر و بر است[45]

درین گلستان بطائرِ گم کرده آشیانی مانم که سراپا کبابِ شعلهٔ آوازِ خویشتن باشد و نفسش از شراره ریزیِ صاعقهٔ فغان و مادم در گداختن. رنگ و بو پرستانِ چمن و سرمستانِ انجمن[46] سازِ بزمِ نشاطش پنداشته و نوای جگرخراشِ اُورا زمزمهٔ عشرتِ[47] خویش انگاشته، برقِ تکلیفِ ناله های دمبدم بر خرمنِ[48] هستیش پیمایند و ندانند که پارهٔ از دل می گدازد و گوشهٔ از جگر فرو میریزد، تا چنین[49] بخون آغشته نوا[50] از منقار بر میخیزد. از بیمِ معاشران نفسم در سینه چون موج[51] با آبگینه درلرزیدنست و از بیدادِ حریفان خونم از دلِ خسته چون آب از کوزهٔ شکسته در تراویدن.

یاران انجمنها ساخته و بتکلیفِ شعرخوانی شمعِ ابرام افروخته. من از حیرت نفس باخته و از خجالت[52] چشم بر پا[53] دوخته. خصوصاً بزرگی از صدر نشینانِ این بزم که کالبدِ معنی را از وی روان در تنست[54]، و پیکرِ مردمی را گل از وی بجیب و دامن، بمعاینهٔ نزاکتِ شیرین ادائیِ قلمش نبات از نیشکر انگشتِ حیرت بدندان، و بملاحظهٔ[55] لطافتِ نظرفریبیِ رقمش بهار

از گل (بر) بنفشه زار خندان۔ جگر تفتگانِ بیدائی شوق را بسایه و چشمه را بسر ہم خلدِ آشتی را طوبیٰ و ہم فردوسِ دوستی را کوثر، برجیس خصائل، بہمن فطرت، امشاسپند شمائل، یزدان سیَر۔ ندانم چه افسونِ توانائی برمن خواند و چه عطرِ دلربائی بَرَدماغم افشاند که سرم را که بگریبانِ دِقِ اندوه فرو رفته بود، از زانو برداشت، و لبم را که بمکیدنِ دلِ دندان زده سری داشت، بحرف و سخن کشود۔

با سراج الدین احمد چاره جز تسلیم نیست
ورنه غالب میگزد شوقِ غزلخوانی مرا

ہرچند زبون صیدِ دامگاهِ حیرانیم و دژم فرو رفتهٔ نشیب لاخ نادانی، بیمم در نوردِ دائرهٔ ہر حرف سراز حلقه، دامی برمی آرد و کلکم در کسوتِ ہر نقطه پشت دستی بر زمین میگزارد۔ امّا خوگریِ اندازِ مہر بانیش را نازم که آتشِ افسردهٔ مرا شعله ور ساخت و خاکِ زمین گیرِ مرا علمِ رعنائیِ غبار ارزانی داشت۔ فرمان داده است که منتخبی از دیوانِ ریخته و غزلی چند از پارسی در یک سفینه باہم در آمیزم و این پردهٔ دو رنگ به پیش طاقِ بینشِ نظارگیانِ یکرنگ آویزم۔ از وی بزبان گفتنی و از من بجان پذیرفتنی۔

بر دلِ سخن پذیر سخن دلپذیر جوی دیده ورانِ دانشمند نہفته مماناد که چون در آغاز خار خارِ جگر کاویِ شوقم ہمه صرفِ نگارشِ اشعارِ اردو زبان بود، در مسلکِ این تحریر نیز ہمان جاده گزارده آمد و ہمان راه سپرده شد که مباد سررشته از کف رود و کار از پرکار افتد۔ ہر آئینه این چمنستان را دو در رو بروی ہم کشودم۔ نخستین در را به اشعارِ ہندی بگوہر آمودم۔ درِ دوم چون آغوشِ شوق بروی پارسیان واست و نامِ این سفینه بزبانِ اداشناسان گلِ رعنا۔

الٰہی! این گلِ رعنا را بگوشهٔ دستارِ قبول جاده، و ہر که این را گرامی (نہد) سپاسی از وی برمن نہی۔ الله بس و ماسویٰ ہوس۔ محرره نہم شوال سـنہ ۱۲ ہجری۔

انتخابِ اُردو

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے، پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر، ہے دم شمشیر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

(۲)

تھا، خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سُود تھا

لکھتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ "رفت" گیا، اور "بُود" تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیُوبِ برہنگی
میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وُجود تھا

(۳)

دوست غمخواری میں میری، سعی فرماوینگے کیا؛
زخم کے بھرتے تلک، ناخن نہ بڑھ جاوینگے کیا؛

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور، کب تلک
ہم کہینگے حالِ دل، اور آپ فرماوینگے کیا؛

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا! یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاوینگے کیا!

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگینگے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراوینگے کیا!

(۴)

دل نہیں، تجھ کو دکھاؤں، ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، (کار فرما جل گیا)

عرض کیجے، جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں!
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ، صحرا جل گیا

(۵)

بوے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، وہ پریشاں نکلا!

کس قدر خاک ہوا ہے، دلِ مجنوں، یارب !
نقشِ ہر ذرّہ، سُویدائے بیاباں نکلا

تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوارئ شوق
سخت مشکل ہے کہ، یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا، غالب!
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، وہ طوفاں نکلا

۱۵

(٦)

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ، طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

جاتی ہے کوئی، کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل میں درد تھا

احباب، چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی، خیال، بیاباں نورد تھا

۲۰

یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

(٧)

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش‌ہاے مژگاں کا!
کہ ہر اک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع، میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا!
قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا ۲۵

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں، کہیں، ورنہ
سبب کیا، خواب میں آکر تبسّم‌ہاے پنہاں کا؟

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشاں کا

(۸)

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منّت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا ۳۰

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۹)

برہمن شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اوس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اوس کا
مسی آلودہ ہے مُہرِ نوازشنامہ، ظاہر ہے
کہ داغِ آرزوے بوسہ دیتا ہے پیام اوس کا
بہ امیدِ نگاہِ خاص، ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عنانگیرِ تغافل لطفِ عام اوس کا

(۱۰)

۳۵

محبّت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

(۱۱)

محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا
یہاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
تو اور سوے غیر نگہ ہاے تیز تیز
میں اور دوکھ تری مژہ ہاے دراز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سرِ شیشہ باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ!
سینہ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

(۱۲)

شب، کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے، دل بیتاب تھا
شوخیِ وحشت سے، افسانہ فسونِ خواب تھا

گرمیِ برقِ طپش سے، زَہرَہ ازبس آب تھا
شعلۂ جوالہ، ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں، کرم کو، عذرِ بارش تھا، عناگیرِ خرام
گریہ سے، یہاں، پنبۂ بالش، کفِ سیلاب تھا

(واں، خود آرائی کو تھا، موتی پرونے کا خیال)
یہاں، ہجومِ اشک میں، تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں، چراغاں آب جو
یہاں، رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

فرش سے تا عرش، واں، طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یہاں، زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

یہاں، سرِ پُر شور، بےخوابی سے تھا دیوار جُو
واں، وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کمخواب تھا

۴۵

یہاں نفس کرتا تھا روشن، شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گُل، وہاں، بساطِ صحبتِ احباب تھا

وہاں، ہجومِ نغمہ ہاے سازِ عشرت تھا، اسدؔ!
ناخنِ غم، یہاں، سرِ تارِ نفس مضراب تھا

(۱۳)

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے، بیاباں ہونا

واے دیوانگیِ شوق کہ، ہر دم مجھ کو
آپ جانا اودھر، اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اوس نے جفا سے توبہ
ہاے، اوس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

(۱۴)

دُود کو آج اوس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتمخانہ تھا

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ! ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

(۱۵)

جلوہ مایوس نہیں، دلِ نگرانی، غافل!
چشمِ امید ہے روزن تری دیواروں کا

وحشتِ نالہ بوا ماندگیِ وحشت ہے
جرسِ قافلہ، یہاں، دل ہے گرانباروں کا

پھر وہ سُوے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے!
رنگ اوڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

(۱۶)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا !
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا ؟

تجاہل پیشگی سے مُدّعا کیا ؟
کہاں تک، اے سراپا ناز، "کیا کیا ؟"

نگاہِ بے مُحابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا ؟

فروغِ شعلۂ خس، یک نَفَس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا ؟ ۶۰

دماغِ بوئے پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا، کیا ؟

نَفَس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا ؟

دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ انا البحر
ہم اوس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا ؟

مُحابا کیا ہے؟ میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ؟

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق، بھلا کیا ؟ ۶۵

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ؟
یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا ؟

بلائے جاں ہے، غالب! اوس کی ہر بات
عبارت کیا، اِشارت کیا، ادا کیا !

(۱۷)

اے وائے! غفلتِ نگہِ شوق، ورنہ یہاں
ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا

قاصد کو، اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
ہاں، اس معاملے میں تو میرا قصور تھا

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو، دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا! ۷۰

(۱۸)

وہی اک بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے، مری رنگیں نوائی کا

(۱۹)

لے تو لوں، سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ، مگر
ایسی باتوں سے، وہ کافر بدگماں ہوجائیگا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائیگا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر، ایک چشمِ خونفشاں ہوجائیگا
سب کے دل میں، ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ، گویا، ایک عالم مہرباں ہوجائیگا
وائے! اگر میرا ترا انصاف، محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ، واں ہوجائیگا

(۲۰)

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل کم دو
مجھے، دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے، ہر بُنِ مُو، کام چشمِ بینا کا

(۲۱)

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(۲۲)

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر، مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا ۸۰

ہم نے وحشتکدۂ بزمِ جہاں میں، جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے، دل، تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا، جان کے کیوں اس کو وفادار، اسدؔ!
غلطی کی کہ، جو کافر کو مسلماں سمجھا

(۲۳)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا ۸۵

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ، مگر، یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(۲۴)

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح، دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اوس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق بہ اندازۂ ہمّت ہے، ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی، سبق شوق مکرّر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا، قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دریاے معاصی تُنُک آبی سے، ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی، ابھی تر نہ ہوا تھا

(۲۵)

مشہدِ عاشق سے، کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر، یا رب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

پوچھ مت بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں!
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منّتِ کیموس تھا

(۲۶)

۹۵

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
جوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے، بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ، اب، کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مرنے کی، اے دل! اور ہی تدبیر کر کہ، میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

۱۰۰

دل سے ہواے کشتِ وفا مٹ گئی کہ وہاں
حاصل، سواے حسرتِ حاصل، نہیں رہا

ہوں قطرہ زن، بمرحلہ یاسِ روز و شب
جز تارِ اشک، جادۂ منزل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا ہوں، پر اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

❁

(۲۷)

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے!
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ، ہے
پُرگُل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا

(۲۸)

رشک کہتا ہے کہ "اس کا غیر سے اخلاص حیف!" ۱۰۵
عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا!"
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزاے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا
شوق، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
میں، اور ایک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

(۲۹)

عشرتِ قطرہ، ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا ۱۱۰

❁

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ!
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

ضعف سے گریہ، مبدّل بدمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں، پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

(۳۰)

پوچھ مت، وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے، ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے، طوفانِ طرب سے، ہر سُو:
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں، بدمِ آبِ بقا، موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیّتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

۱۱۵

شرحِ کیفیتِ مستی ہے، زہے، موسمِ گل!
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب! ۱۲۰

(۳۱)

جاتا ہوں جدھر، سب کی اوٹھے ہے اودھر انگشت
یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے، مگر انگشت
کافی ہے نشانی تیرا چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے، بوقتِ سفر انگشت
خوں دل میں جو میرے نہیں باقی، تو پھر اوس کی
جوں ماہیِ بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت
افسوس، کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی، درخورِ عقدِ گہر انگشت
لکھتا ہوں، اسد! سوزشِ دل سے سخنِ گرم ۱۲۵
تا رکھ نہ سکے کوئی، مرے حرف پر انگشت

(۳۲)

قیس بھاگا، شہر سے شرمندہ ہو کر، سوے دشت
بن گیا تقلید سے میری، یہ سودائی، عبث

(۴۳)

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفَس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام! چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و دَر ہے، آج

معزولیِ تپش ہوئی، افراطِ انتظار
چشمِ کشودہ، حلقۂ بیرونِ دَر ہے آج

(۴۴)

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے، آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے، کوئی، قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے، تو اوس میں سے دھواں اوٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

آے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا، غالب!
کس کے گھر جائیگا سیلابِ فنا، میرے بعد؟

(۳۵)

نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

۱۳۵

مجھے، اب دیکھ کر، ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا
کہ فرقت میں تیری آتش برستی تھی گلستاں پر

اسدؔ! اے بے تحمّل عَربدہ بیجا ہے، ناصح سے
کہ آخر، بیکسوں کا زور چلتا ہے، گریباں پر

(۳۶)

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو، سمجھے ہوئے ہیں قرض، رہزن پر

ہم، اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے، تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے، اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف، گلخن پر

(۳۷)

۱۴۰

فارغ مجھے نہ جان کہ، جوں صبح و آفتاب
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

(۳۸)

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
ہوں میں، اپنی شکست کی آواز

لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں، اور رازہائے سینہ گداز

تو، اور آرایشِ خمِ کاکل
میں، اور اندیشہ ہائے دور دراز

(۳۹)

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، اک بار
خوب وقت آئے تم، اِس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود، پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن، اے دل!
نہ کھڑے ہوجیے، خوبانِ دل آزار کے پاس

مر گیا، پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی، ہے ہے!
بیٹھنا اوس کا وہ، آکر، تری دیوار کے پاس

(۴۰)

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے ۱۵۰
لگا وے خانۂ آئینہ میں روے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

(۴۱)

رُخِ نگار سے، ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل، آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں، ہے مرگ، خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے، اے شعلہ!
ترے لرزنے سے ظاہر ہے، ناتوانیِ شمع

(۴۲)

کون آیا، جو چمن بیتابِ استقبال ہے؟ ۱۵۵
جنبشِ موجِ صبا، ہے شوخیِ رفتارِ باغ
آتشِ رنگِ رخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سردِ صبا سے، گرمیِ بازارِ باغ

(۴۳)

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبور یہاں تلک ہوئے، اے اختیار، حیف
تھے میرے ہی جلانے کو، اے آہِ شعلہ ریز
گھر پر پڑا نہ غیر کے، کوئی شرار، حیف!
ہیں، میری مشتِ خاک سے، اس کو کدورتیں
پائی جگہ بھی دل میں، تو ہو کر غبار، حیف!
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نَفَسِ شعلہ بار، حیف!

(۴۴)

یاد ہیں، اے ہمنشیں! وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا، نمک
داد دیتا ہے میرے زخمِ جگر کی، واہ واہ!
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا، نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق، حیف ہے!
دل طلب کرتا ہے زخم، اور مانگے ہیں اعضا، نمک

(۴۵)

دام، ہر موج میں، ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہوتے تک!

۱۶۵

ہم نے مانا کہ، تغافل نہ کروگے، لیکن
خاک ہوجائینگے ہم، تم کو خبر ہوتے تک

یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی، غافل!
گرمیِ بزم ہے، اک رقصِ شرر ہوتے تک

(۴۶)

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی، بغیرِ یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے، داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے حسابِ بے گنہی، اے خدا! نہ مانگ

(۴۷)

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ ہوائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

۱۷۰

خوشحال اوس حریفِ سیہ مست کا، ہے جو
رکھتا ہو، مثلِ سایۂ گل، سر بپائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

(۴۸)

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفَس
برق سے کرتے ہیں روشن، شمعِ ماتم خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پر موہوم ہیں
جوں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں، لاکھوں تمنائیں، اسد!
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

(۴۹)

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اوس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت، قُلزُم آشامی مری
موجِ مے کی آج، رگ، مینا کی گردن میں نہیں

١٧٥

(۵۰)

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے! ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں!
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ خوباں ہی کے تصوّر سے اب، وہ رعنائیِ خیال کہاں
مضمحل ہو گئے قوا، غالبؔ! وہ عناصر میں اعتدال، کہاں!

(۵۱)

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا گر ایک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
ظالم میرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ! ہے ہے، خدا نکردہ، تجھے بیوفا کہوں!
میں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو، اور ایک وہ نشنیدن کہ، کیا کہوں
حلقے ہیں چشمہائے کشودہ بسُوئے دل ہر تارِ زلف کو نگہِ سُرمہ سا کہوں ۱۸۵

(۵۲)

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ، ہاں
رنگ لاویگی ہماری فاقہ مستی، ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل! غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائیگا، یہ سازِ ہستی ایک دن
دَھول دَھپہ اُوس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے، غالبؔ! پیشدستی ایک دن

(۵۳)

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو، کہ جہاں
جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید! گوارا رہیو
خوش ہوں، گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

۱۹۰

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا، غالب!
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

ریختے کا وہ ظہوری ہے، بقولِ ناسخ
"آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں"

(۵۴)

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری، شجرِ بید نہیں

ہے تجلی تیری، سامانِ وجود
ذرہ، بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

۱۹۵

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتی ہے امید پہ خلق
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ، غالب! عرقِ بید نہیں

(۵۵)

ہے نزاکت، بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
اُلفتِ گل سے غلط ہے، دعویٔ وارستگی
سرو ہے، باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

(۵۶)

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
(خارِ الم سے، پشت بدنداں گزیدہ ہوں)
دیتا ہوں کشتگاں کو سخن سے سرِ تپش
مضرابِ تارہاے گلوے بُریدہ ہوں
ہوں، گرمیِ نشاطِ تصوّر سے، نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
سرپر میرے، وبالِ ہزار آرزو رہا
یارب! میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں؟

(۵۷)

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدّر ہے، جو مذکور نہیں

قطرہ اپنا بھی، حقیقت میں، ہے دریا، لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت، اے ذوقِ خرابی کہ، وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں، تنِ رنجور نہیں

ظلم کر، ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل سے، کسو رنگ میں معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں، ہم لوگ
وائے، وہ بادہ کہ، افشردۂ انگور نہیں!

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی، غالب!
میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں

۲۱۰

(۵۸)

نالہ جُز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد، نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم!
دشت میں ہے مجھے راحت وہ کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو، ہے طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج، کم از سیلیِ اوستاد، نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا! ۲۱۵
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو، غربت کی شکایت، غالبؔ!
تم کو دل تنگیِ زندانِ وطن یاد نہیں؟

(۵۹)

ہوئی یہ بیخودیِ چشم و زباں کو، تیرے جلوے سے
کہ طوطی قفلِ زنگ آلودہ ہے آیینہ خانے میں
قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا: "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"
دلِ نازک پہ اوس کے رحم آتا ہے مجھے، غالبؔ
نہ کر سرگرم اوس کافر کو، الفت آزمانے میں

(۶۰)

پاؤں میں، جب وہ، حنا باندھتے ہیں | میرے ہاتھوں کو، جدا باندھتے ہیں ۲۲۰
آہ کا، کس نے، اثر دیکھا ہے؟ | ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی، معلوم! اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشّۂ رنگ سے ہے، واشُدِ گل مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں!
تیری فرصت کے مقابل، اے عمر! برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
غلطیہاے مضامیں، مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں ۲۲۵
کس کا دل زلف سے بھاگا کہ، اسدؔ!
دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

(۶۱)

دیوانگی سے، دوش پہ، زُنّار بھی نہیں
یعنی، ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو، نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا، تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
گنجایشِ عداوتِ اغیار، یک طرف
یہاں دل میں ضعف سے، ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہ ہاے زار سے میرے، خدا کو مان ۲۳۰
آخر، نواے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں، ہے یار (کی) صفِ مژگاں سے، رُوکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے، اے خدا!
لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے، ہے سر، وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں، بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہُشیار بھی نہیں

(۶۲)

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سُوَیدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں تن میں

۲۳۵

ہوئی ہے، مانعِ شوقِ تماشا، خانہ ویرانی
کفِ سیلاب، باقی ہے، برنگِ پنبہ، روزن میں

نہ جانوں، نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں، تو ہوں گلخن میں؛ جو خَس ہوں تو، ہوں گلشن میں

اسد! زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش، ہو گیا ہے طوق، گردن میں

(۶۳)

پُرسشِ طرزِ دلبری، کیجیے کیا کہ بِن کہے
اوس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ، یوں

کب مجھے کوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی!
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ، یوں

۲۴۰

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سُن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں؟"

(۶۴)

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے، رنگ اِختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبّت ہی کیوں نہ ہو!

ہے مجھ کو، تجھ سے تذکرۂ غیر کا گِلا
ہر چند، بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو!

ہے آدمی، بجاے خود، ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو!

مٹتا ہے، فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو!

۲۴۵

(٦٥)

وہاں پہنچ کر، جو غش آتا پئے، ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

دل کو میں، اور مجھے دل، محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم، ہے ہم کو!

ضعف سے، نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن
تیرے کوچہ سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو!

جان کر کیجے تغافل کہ، کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز، تو سم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگ حزیں
نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

۲۵۰

سر اوڑانے کے، جو وعدہ کو مکرّر چاہا
ہنس کے بولے کہ، "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو

ابر روتا ہے کہ "بزمِ طرب آمادہ کرو"
برق ہنستی ہے کہ "فرصت کوئی دم ہے ہم کو"

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو ۲۵۵

طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے، اتنی
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں، ایک توقع، غالب!
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

(۶۶)

ہندوستان سایۂ گل پاے تخت تھا — جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ، یک دلِ داغ انتظار ہے — عرضِ فضاے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ ۲۶۰

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے — دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ "آہ!
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ"

(٦٧)

ہے سنگ پر، براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی، ہنوز منّتِ طفلاں اوٹھائیے
دیوار، بارِ منّتِ مزدور سے، ہے خَم
اے خانماں خراب! نہ احساں اوٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اوٹھائیے

(٦٨)

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی، اور ایک شخص پر
آخر، ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے!
دے داد، اے فلک! دلِ حسرت پرست کی
ہاں، کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں، مہ رخوں کے لیے، ہم مصوّری
تقریب، کچھ تو، بہرِ ملاقات چاہیے
مَے سے غرض نشاط، ہے کس رُو سیاہ کو!
ایک گونہ بیخودی، مجھے دن رات چاہیے
نشو(و) نما ہے اصل سے، غالب! فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل (و) نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں، بہار کا اثبات چاہیے

سر، پائے خُم پہ کھینچیے، ہنگامِ بیخودی
رُو، سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی، بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف، ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

(۶۹)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے، بہ اندازِ چکیدن، سرنگوں، وہ بھی

نہ کرتا کاش، نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمدم!
کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں، وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے!
مرے دامِ تمنا میں، ہے ایک صیدِ زبوں وہ بھی

(۷۰)

کیا تنگ، ہم ستم زدگاں کا جہان ہے!
جس میں کہ ایک بیضۂ مور، آسمان ہے

ہے، بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
ہم بھی اسی میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

۲۸۰

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

(۷۱)

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو، کہیں!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہے ہے، خدانخواستہ، وہ اور دُشمنی!
اے شوق! منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے؟

کس پردہ میں، ہے آئینہ پرداز؟ اے خدا!
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

(۷۲)

کیا کروں، غمہائے پنہاں، لے گئے صبر و قرار
دُزد گر ہو خانگی، تو پاسباں معذور ہے

۲۸۵

آگ سے، پانی میں بجھتے وقت، اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی، درماندگی میں، نالہ سے مجبور ہے

۷۳

مجھ سے مت کہہ: "تو ہمیں کہتا تھا، اپنی زندگی"
زندگی سے بھی، مرا جی، ان دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے، کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ، یہاں تک حسرتِ دیدار ہے
ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
ظاہراً کاغذ ترے خط کا، غلط بردار ہے

۷۴

خزاں کیا؟ فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو!
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

۲۹۰

وفائے دلبراں، ہے اتفاقی، ورنہ، اے ہمدم!
اثر، فریادِ دلہائے حزیں کا، کس نے دیکھا ہے؟
بہجومِ ریزشِ خوں کے سبب، رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجۂ صیّاد مرغِ رشتہ بر پا ہے

۷۵

بیدادِ انتظار کی طاقت نہ لا سکی — اے جانِ برلب آمدہ! بیتاب ہو گئی؟
غالبؔ! از بسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک — آنسو کی بوند، گوہرِ نایاب ہو گئی

۷۶

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی — میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی ۲۹۵
کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف! — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں! — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
چھیڑ خوباں سے چلی جائے، اسدؔ! — گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

۷۷

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے ۳۰۰
بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے، پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اِقامت کی تاب ہے
میں نامراد، دل کی تسلّی کو کیا کروں؛
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ! مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

(۷۸)

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن، ہے خندۂ دنداں نما مجھے
کرتا ہے، بسکہ باغ میں تو، بیحجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے ۳۰۵
کُھلتا کسی پہ کیوں، مرے دِل کا معاملہ!
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

(۷۹)

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ، جو اوس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ، اوس محفل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی! خاک میں مل جائیگی
یہ جو ایک لذّت ہماری سعیِ بیحاصل میں ہے

(۸۰)

کروں بیدادِ ذوقِ پَر فشانی عرض، کیا قدرت! ۳۱۰
کہ طاقت اوڑگئی، اوڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں، اوس کے خیمہ کے پیچھے، قیامت ہے!
میری قسمت میں، یارب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

(۸۱)

پھر، کچھ اک، دل کو، بیقراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر، جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر، وہی پردۂ عماری ہے
چشم، دلّالِ جنسِ رسوائی — دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے ۳۱۵
وہی، صد رنگ نالہ فرسائی — وہی، صد گونہ اشکباری ہے
دل، ہوائے خرامِ ناز سے، پھر — محشرستانِ بیقراری ہے
جلوہ، پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روز بازارِ جاں سپاری ہے
پھر، اوسی بیوفا پہ مرتے ہیں — پھر، وہی زندگی ہماری ہے
پھر، کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ق — گرم، بازارِ فوجداری ہے ۳۲۰
ہو رہا ہے، جہان میں، اندھیر — زلف کی، پھر سررشتہ داری ہے
پھر، دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر، ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشکباری کا حکم جاری ہے

بیخودی بے سبب نہیں، غالب!
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے

(۸۲)

پنہاں تھا، دام سخت قریب آشیان کے
اوڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

نالے، عدم میں، چند ہمارے سپرد تھے
جو وہاں نہ کھچ سکے، سو وہ یہاں آکے دم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند، اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے! تیری تندیِ خُو، جس کے بیم سے
اجزائے نالہ، دل میں میرے، رزقِ ہم ہوئے

(۸۳)

رحم کر، ظالم! کہ کیا بُودِ چراغِ کشتہ ہے!
نبضِ بیمارِ وفا، دُودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو، بیچین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یہاں بیرونقی، سُودِ چراغِ کشتہ ہے

ہو جہاں تیرا دماغِ ناز، مستِ بیخودی
خوابِ نازِ گُلرخاں، دُودِ چراغِ کشتہ ہے

(۸۴)

ق

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل!
زنہار، اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ، ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں
نہ وہ سرور و شور، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

۳۳۵

(۸۵)

آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے — نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے ۳۴۰

گریہ نکالے ہے، تیری بزم سے مجھ کو — ہائے کہ، رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث، ہے گمانِ رنجشِ خاطر — خاک میں عُشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اوٹھا لُطفِ جلوہ ہائے معانی — غیرِ گل، آیینہ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو، بارے — وائے اگر عہد استوار نہیں ہے!

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے، غالب! ۳۴۵

تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۸۶)

بہا ہے یہاں تک اشکوں میں، غبارِ کُلفتِ خاطر

کہ چشمِ تر میں، ہر یک پارۂ دل، پائے در گل ہے

رفوئے زخم سے مطلب، ہے لذّت زخمِ سوزن کی

سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے، غالب!

چٹکنا غنچۂ گُل کا، صدائے خندۂ دل ہے

(۸۷)

پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرانورد

خارِ پا، ہیں جوہر آیینۂ زانو مجھے

۳۵۰ دیکھنا حالت میرے دل کی کہ، ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو، مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ، لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

(۸۸)

مے پرستاں! خُمِ مے منہ سے لگا لو یعنی
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی
نَفَسِ قیس کہ، ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
۳۵۵ نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی، نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالبؔ! اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

(۸۹)

غمِ زمانہ نے جھاڑی، نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اوٹھاتے تھے، لذّتِ الم آگے

دل و جگر میں پَرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے، اس کو دم آگے

خدا کے واسطے، داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اوس کے در پہ پہنچتے ہیں، نامہ بر سے، ہم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی (میرے) کھاتے ہیں، غالب!
ہمیشہ کھاتے تھے، جو میری جان کی قسم آگے

۳۶

(۹۰)

کب وہ سنتا ہے کہانی میری! اور، پھر وہ بھی، زبانی میری!

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے میرا روئینگے یار! مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں ز خود رفتۂ بیداے خیال بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل، ہے مقابل میرا رک گیا، دیکھ، روانی میری

۳۶۵

گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں صرصرِ شوق، ہے بانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

دہن اوس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز، غالبؔ!
ننگِ پیری، ہے جوانی میری

(۹۱)

۳۷۰

تو وہ بدخو کہ، تحیّر کو تماشا جانے
دل وہ افسانہ کہ، آشفتہ بیانی مانگے

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس، پئے خامۂ مانی مانگے

(۹۲)

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے، ایک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشّاق کی بے حوصلگی سے؟
صاحب! کوئی سنتا نہیں فریادِ کسو کی

ق

صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے، غالبؔ!
حسرت میں رہے، ایک بتِ عربدہ جو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو ۳۷۵
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

(۹۳)

اوس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو، ہاں
شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیے

ہے، وصل، ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

جادو ہے یار کی روشِ گفتگو، اسدؔ!
یہاں جز فسوں نہیں، اگر افسانہ چاہیے

(۹۴)

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جاے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

دوستی کا پردہ، ہے بیگانگی — منہ چُھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے ۳۸۰

چاک مت کر جیب، بے ایامِ گل — کچھ اودھر کا بھی اشارا چاہیے

اپنی، رسوائی میں کب چلتی ہے، سعی! — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اوس کی دیکھا چاہیے

(۹۵)

ہر قدم، دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے، بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں ۳۸۵
دُود کی طرح، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

اثرِ آبلہ کرتا ہے بیاباں روشن
جادہ، جوں رشتۂ گوہر، ہے چراغاں مجھ سے

نگہِ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ!
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں، مجھ سے

(۹۶)

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا!
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

(۹۷)

کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تیری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے ۳۹۰
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

(۹۸)

تپش سے میری، وقفِ کشمکش، ہر تارِ بستر ہے
میرا سر رنجِ بالیں ہے، میرا تن بارِ بستر ہے
بطوفان گاہِ جوشِ اضطرارِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

(۹۹)

نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا
کہ اوس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں، تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ، بظاہر نگاہ سے کم ہے

(۱۰۰)

کیوں نہ ہو، چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؛
یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اوس کافر کا خنجر تیز ہے

(۱۰۱)

گل، سر بسر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے
نازِ بہار، جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

۲۹۵

(۱۰۲)

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں! کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے!

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے، میرے گھر کی دربانی مجھے؟

وائے، واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا!
لے گیا تھا گور میں، ذوقِ تن آسانی مجھے

۴۰۰

میرے غمخانے کی قسمت، جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی، مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی، اوس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے صیدِ پرسش ہائے پنہانی، مجھے

ہاں، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ، واہ!
پھر ہوا ہے تازہ، سودائے غزلخوانی مجھے

(۱۰۳)

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اولٹی ہے!
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھچتا جائے ہے مجھ سے

اودھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اوس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

۴۰۵

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ!
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۱۰۴)

رونے سے، اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم، اتنے کہ بس پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے، آوارگی سے، تم
بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون، نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردہ میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا، وجود و عدم اہلِ شوق کا؟
آپ اپنے شعلہ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اوس سے تغافل کا، ہم گلا
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے، آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

اس رنگ سے اوٹھائی کل، اوس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

(۱۰۵)

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب — شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہمنشیں! مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ یار" — واں تو، میرے نالے کو بھی، اعتبارِ نغمہ ہے ۴۱۵

(۱۰۶)

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعویِ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل، در قفائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے، ہیں احباب منکر، ورنہ یہاں
دل، محیطِ گریہ و لب، آشنائے خندہ ہے

(۱۰۷)

رونے سے، اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی!
چاکِ جگر سے، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ، جیب کو رسوا کرے کوئی؟ ۴۲۰
ناکامیِ نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ، تجھ کو تماشا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کو، ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی؟

(۱۰۸)

کمالِ حسن، اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

(۱۰۹)

باغ، پاکر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

(۱۱۰)

لبِ عیسیٰ کی جنبش، کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

(۱۱۱)

پیچ آپڑی ہے، وعدۂ دلدار کی، مجھے
وہ آوے یا نہ آوے، پہ یہاں انتظار ہے
اے عندلیب! یک کفِ خس، بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
حیراں ہوں، شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر
یہاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برار ہے

دل مدّعی ہے، دیدہ بنا مدّعیٰ علیہ
نظّارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

(۱۱۲)

۴۲۰

ہوں میں بھی، تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

(۱۱۳)

غالبؔ بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

(۱۱۴)

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے، عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قُلزمِ صرصر کا مَرجاں ہے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دستگرداں ہے

(۱۱۵)

شعلہ سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے!

تمثال میں تیری، ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل، آغوش کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
جز نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

خو نے تیری، افسردہ کیا، وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی، طرفہ بلا ہے!

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی، ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے!

(۱۱۶)

مدت ہوئی ہے، یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع، پھر، جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے، دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر، گرمِ نالہ ہائے شرر بار، ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر، وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے، دم
برسوں ہوئے ہیں، چاک گریباں کیے ہوئے

پھر، پرسشِ جراحتِ دل کو، چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر، بھر رہا ہوں، خامۂ مژگاں، بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

۴۴۵ باہم دگر ہوئے ہیں، دل و دیدہ، پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل، پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ، ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے، پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

۴۵۰ ڈھونڈے ہے، پھر، کسو کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز، دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

مانگے ہے، پھر، کسُو کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ، پریشاں کیے ہوئے

ایک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر، نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈھتا ہے، پھر، وہی فرصت کہ، رات دن
بیٹھے رہیں، تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

پھر، دل میں ہے کہ، در پہ کسُو کے پڑے رہیں
سر، زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

غالبؔ! ہمیں نہ چھیڑ کہ، پھر، جوشِ اشک سے!
بیٹھے ہیں ہم، تہیّۂ طوفاں کیے ہوئے

۲۵۵

انتخابِ فارسی

سلسلہ جنبانیِ درِ دوم این رنگین چمن موسوم بہ گُلِ رعنا
درعرضِ مذاقِ زبانِ پارسی کہ صہبای حریف افگن است
و بادۂ مرد آزما۔ ازانجا کہ ہنوز ایں گہرہای شاہوار برشتہ
نمطِ حروفِ تہجی نکشیدہ ام و ایں اوراقِ پراگندہ را
شیرازۂ جمعیتِ تدوین نبستہ فرو ہیدہ فرہنگانِ بخردی
پیشہ و سنجیدہ آہنگانِ موزونی اندیشہ خُردہ بر بیربطیِ تحریر
نگیرند و عذرِ تنگ سرمایگانِ فطرت و بیدماغانِ عالمِ
فرصت بپزیرند۔

(۱)

قصیدہ

در مدحِ صاحب والا مناقب عالیشان فیض بخشِ فیض رسان جناب مستطاب مستر اندرو استرلنگ بہادر دام اقبالہ

فغان کہ نیست سر و برگِ دامن افشانی — بہ بندِ خویش فرو ماندہ ام ز عریانی
فغان کہ ریخت تمنای بستر و بالیں — خسک بہ پیرہنِ لذتِ تن آسانی
فغان کہ نامۂ شوقم بچار سوی قبول — نبرد راہ بجائی ز ہرزہ عنوانی
فغان ز عمر کہ در سنگلاخِ زندگیم — بزیرِ کوہ بود دامن از گرانجانی

فغان، ز غفلتِ دریوزه زندگی کامروز — بیادِ هر نفسی می کشم پشیمانی ۵

فغان که، سوخت غمِ دهرم آنچنان کاینک — ز هم، بریزم اگر، بکرهم بجنبانی

فغان که، داد ندادی و وقتِ آن آمد — که خاکِ گور سرم را کند گریبانی

فغان، ز بختِ مخالف که زورقِ صبرم — بچار موجِ بلا گشته است طوفانی

فغان که، گدیه خورِ داورانِ عهد رود — به بیشِ همچو خودی بهرِ کاسه گردانی

فغان که، در عملِ صاحبانِ عالیشان — کشم جفای فلانی و جورِ بهمانی ۱۰

بمن نماند ز هستی نشان که، باخته‌ام — نَفَس زَخوفِ عدو چون نگاهِ قربانی

کنون ز سطوتِ اعدا شکنجه، بیم است — دلی که بود طربگاهِ روحِ حیوانی

برنگِ موجِ دخانی که خیزد از سرِ شمع — همی پرد ز دماغم، قوای نفسانی

نه پای آنکه برآیم، ازین گرفتاری — نه جای آنکه بمانم درین پریشانی

به دادِ من که رسد کاندرین بساط مرا — گلو فشرده (و) خون کرده اند پنهانی ۱۵

مگر تلافیِ آزارِ من کند روزی — بمقتضای خداترسی و خدادانی

بقای عیش و نشاطِ زمانه را ضامن — بنای بارگهِ عدل و داد را بانی

بهارِ روضهٔ آفاق مستر استرلنگ — کز دستِ گلبنِ انصاف در گل افشانی

نظامِ عالم و آدم که در جریدهٔ دهر — صحیح کرده قوانینِ معدلت رانی

اگرچه سنجر و کسریٰ و خسروانِ دگر — فگنده اند در آفاق شورِ سلطانی ۲۰

توان بقاعدۂ قصر بالمبالغہ گفت | کہ اوست مخترعِ شیوۂ جہانبانی
خوشا لطافتِ اندازۂ ادا فہمی! | زہی نزاکتِ اندازِ مدعادانی!
کہ شد ببزمِ نگاہش کہ او بدید و نخواند | غمِ درونِ وی از سطرِ چینِ پیشانی
زہی مربیِ بیمایگان کہ از فیضش | سراب کردہ محیطی و قطرہ طوفانی
ز خاکِ درگہِ او ذرہ ذرہ ہر طرفی | بہ آفتاب طرف گشتہ در درخشانی ۲۵
بقای عشرتِ او را چمن دعاگو یست | ز قطرہ قطرۂ شبنم بسبحہ گردانی
بہار باد فروشیست بزمِ جاہش را | بصد زبانِ رگِ گل در آفرین خوانی
حضورِ مدح رخ از من نہفت می ترسم | کہ غیب افگندم در طلسمِ حیرانی
مگر سری کہ فرو بردہ ام بدلقِ خیال | بر آورم ز گریبان مطلعِ ثانی

زہے کریم کہ دستت بگوہر افشانی ۳۰
بگاہِ عرض گرو بردہ ز ابرِ نیسانی

نفس ز خوی تو گلدستہ بندِ رنگینی | نگہ ز روی تو آئینہ دارِ حیرانی
لبِ تو زندہ کنِ معجزِ مسیحائی | رخِ تو جلوہ دہِ شوکتِ سلیمانی
بصفحہ از خمِ تیغِ تو گر کشد نقشی | چو خامہ شق شود از بیم پیکرِ مانی
فلک بدرگہِ جاہِ تو معتکف پیریست | ز روز و شب بکفش سبحۂ سلیمانی
بہ گردِ سمِ سمندِ تو نسبتی دارد | سرود کہ ناز کند سرمۂ صفاہانی ۳۵

سپهر بارگها! روزگار مرتبتا!
که از تو یافته، جنسِ کرم فراوانی

براوجِ قصرِ جلالت، به نیمه ره نرسد
خیالِ انوری و سعیِ فکرِ خاقانی

چو من شکسته دلِ بینوای هیچدان
چگونه دم زند، از دعویِ ثناخوانی

گدایم و بتمنای داد آمده ام
بدرگهی که بود قیصرش بدربانی

نه مُلک خواهم (و) نی مال، اینقدر خواهم
که گردِ غم، ز رُخِ بختِ من بیفشانی ۳۰

مرا دلیست، ز دردِ شکستگی لبریز
نه آرزوی امیری، نه حسرتِ خانی

ز بست سال فزون میرود که میسوزد
نَفَس چو رشته، شمعم، ببزمِ حیرانی

کجاست جیب که چاکی درو توانم زد
مگر جگر بدریدن دهم، ز عریانی

ز اهلِ دهر، درین روزگارِ بیدردی
بعیدِ عشرتِ خویشم نموده قربانی

سیاه مست، ندارد ز کس محابائی
شمرده خونِ دلم را، رحیقِ ریحانی ۳۵

شرر به پیرهنِ جا(ن)، فشانده جانگزاشت
که شعله سرکشد، از داغهای پنهانی

چنان بحلقهٔ دامم کشیده تنگ که من
ز عجزِ بال فرو ماندم از پرافشانی

غریب نیست، بدردِ دلم رسیدن ها
نه مدعی عربی و نه من خراسانی

بدادگاه رسیدم، چنان که دانستم
برس بدادِ غریبان، چنانکه میدانی

بود توقعِ آنم که، دادِ ناکامی
دهی دهر چه بمن داده اند، بدهانی ۴۰

بعجز کوش که غالب! طریقهٔ ادبست
نگاه داشتنِ اندازهٔ سخن رانی

خوش است، اگر ز نسیمِ دعا بگلشنِ صدق
نهالِ جلوهٔ آمین کند گل افشانی
همیشه تا که بود سایه تیره و تاریک
مُدام تا که بود مهر را درخشانی
چو سایه، روزِ عدوی تو، باد ظلمت ناک
چو مهر، جبههٔ بختِ تو، باد نورانی

(۲)

ساقیِ بزمِ آگهی روزی
راوقی ریخت در پیالهٔ من ۵۵
چوں دماغم رسید زان صهبا
شدم از ترکتازِ وهم ایمن
همدرانِ بیخودیِ حریفانه
بی محابا گرفتمش دامن
گفتم: "ای محرمِ سرای سرور!
از ادب دور نیست پرسیدن"
"اول، از دعویِ وجود، بگو!"
گفت: "کفر است، در طریقتِ من"
گفتم: "آخر، نمودِ اشیا چیست؟"
گفت: "ہی ہی! نمیتوان گفتن" ۶۰
گفتمش: "با مخالفان چکنم؟"
گفت: "طرحِ بنای صلح فگن"
گفتمش: "حبِ جاه و منصب چیست؟"
گفت: "دامِ فریبِ اهرمن"
گفتمش: "چیست منشاءِ سفرم؟"
گفت: "جور و جفای اهلِ وطن"
گفتم: "ایدون بگو که، دہلی چیست؟"
گفت: "جانست و این جهانش تن"

گفتمش: "چیست این بنارس؟" گفت: "شاہدِ مست، محوِ گل چیدن" ٦٥

گفتمش: "سلسبیل خوش باشد!" گفت: "خوشتر نباشد از سوہن"

گفتمش: "چہ بود این عظیم آباد؟" گفت: "رنگین تر از ہزار چمن"

حالِ کلکتہ باز جُستم، گفت: "باید اقلیمِ ہشتمش گفتن"

گفتم: "آدم بہم رسد در وَے؟" گفت: "از ہر دیار و از ہر فن"

گفتم: "این جا چہ کار باید کرد؟" گفت: "قطعِ نظر ز شعر و سخن" ٧٠

گفتم: "این جا چہ شغل سُود دہد؟" گفت: "از ہر کہ ہست، تریدن"

گفتم: "این ماہ پیکران چہ کنند؟" گفت: "خوبانِ کشورِ لندن"

گفتم: "اینان مگر دلے دارند؟" گفت: "دارند، لیکن از آہن"

گفتم: "از بہرِ داد آمدہ ام" گفت: "بگریز و سر بسنگ مزن"

گفتم: "اکنون مرا چہ زیبد؟" گفت: "آستین، بر دو عالم، افشاندن" ٧٥

گفتمش: "باز گو طریقِ نجات" گفت: "غالب! بہ کربلا رفتن"

(۳)

نہ چنانم کہ، دانہ نابستہ مزرعِ خویش وقفِ داس کنم

نہ چنانم کہ، گندم و جَو را داغ از حسرتِ خراس کنم

نچنانم که از نصیحت و وعظ | عالمی را خداشناس کنم

نچنانم که بر عقیدهٔ خویش | از فسون کسی هراس کنم ۸۰

نه که اخبار باستانی را | دیو افسانها قیاس کنم

نه که ز آثار هر چه مشهور است | اثری تازه اقتباس کنم

نه که در عالم فراخ روی | عار از ژندهٔ پلاس کنم

نه که از بهر حلّه های بهشت | ترک اَلوان این لباس کنم

نه ز امیدهای بیهوده | کاخ دل را قوی اساس کنم ۸۵

نه بطوفان ناامیدیها | خانمان نذر سیل یاس کنم

نچنان در هوس شلاینم | که به هر مدّعا مکاس کنم

نچنان بزدلم که در ره سعی | جاده را اژدها قیاس کنم

چون نه من ساقیم، نه محتسبم | نه بریزم، نه مَی بکاس کنم

شیوهٔ من همه میانه رَوی است | راست گویم، چرا هراس کنم ۹۰

فصلی از مدح خود توانم خواند | گر نه لب را ز لاف پاس کنم

خوشنوایم، مرا رسد که ز رشک | زهر در جام بُو نُواس کنم

میتوان پنجه از نظامی برد | پارهٔ جمع گر حواس کنم

همچو سَرو از غم خزان برهد | گلبنی را که من بباس کنم

کوثر از موج واکند آغوش | اگر آهنگِ ارتماس کنم ۹۵
مہرِ اوجِ سخن علی حزیں | ایں دو بیت از وے اقتباس کنم
"لائقِ مدح در زمانہ چو نیست | خویشتن را ہمی سپاس کنم"
"کس زبانِ مرا نمی فہمد | بعزیزان چہ التماس کنم"

(۴)

مثنوی

نَفَس با صُور دمساز است امروز | خموشی محشرِ راز است امروز
رگِ سنگم، شراری مینویسم | کفِ خاکم، غباری مینویسم ۱۰۰
دل، از شورِ شکایتہا، بجوشست | حبابِ بینوا، طوفان خروشست
بلب، دارم ضمیرِ آلا بیانی | بدل، خونِ جگر پالا فغانی
پریشان تر ز خویشم داستانیست | بدعوئ ہر سرِ مُویم زبانیست
شکایت گونۂ دارم ز احباب | کتانِ خویش میشویم بمہتاب
نَفَس ابریشمِ سازِ فغان است | بسانِ نَی تبم در استخوانست ۱۰۵
در آتش، از نوای سازِ خویشم | کبابِ شعلۂ آوازِ خویشم
محیط افگندہ بیرون گوہرم را | چو گرد افشردہ آہن جوہرم را
ز دہلی تا برون آوردہ بختم | بطوفانِ تغافل دادہ رختم

کس، از اہلِ وطن، غمخوارِ من نیست — مرا در دہر، پنداری، وطن نیست

گرفتم کز جہان آباد رفتم — عزیزان را چرا از یاد رفتم ۱۱۰

مگو، داغِ فراقِ انجمن سوخت — غمِ بیمہریِ اہلِ وطن سوخت

سپس در لالہ زارے جا توان کرد — وطن را داغِ استغنا توان کرد

نباشد قحط بہرِ آشیانی — سرِ شاخِ گلی در بوستانی

جہان آباد گر نبود، الم نیست — جہان آباد بادا، جای کم نیست

بخاطر دارم اینک گلزمینی — بہار آیین سوادِ دل نشینی ۱۱۵

کہ می آید بدعوی گاہِ لافش — جہان آباد از بہرِ طوافش

نگہ را دعویِ گلشن ادائی — ازان خرّم بہارِ آشنائی

سخن را نازشِ رنگین تماشی — ز گلبانگِ ستایشہای کاشی

تعالی اللہ، بنارس، چشمِ بد دور! — بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور

بنارس را کسی گفتا کہ چین است — ہنوز، از گنگ، چینش بر جبین است ۱۲۰

بخوش پُرکاریِ طرزِ وجودش — ز دہلی میرسد ہر دم دُرودش

بنارس را مگر دیده است، در خواب — کہ میگردد ز نہرش، در دہن آب

حسودش گفتن، آیینِ ادب نیست — ولیکن، غبطہ گر باشد عجب نیست

تناسخ مشربان چون لب کشایند — بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند

که هر کس کاندران گلشن بمیرد — دگر پیوندِ جسمانی نگیرد ۱۲۵

چمن سرمایهٔ امید گردد — بمردن زندهٔ جاوید گردد

زهی آسودگی بخشِ روانها — که داغِ جسم می شوید ز جانها

شگفتی نیست از آب و هوایش — که تن ها جان شود اندر فضایش

بیا ای غافل! از کیفیت ناز — نگاهی بر پریزادانش انداز

همه جانهای بی تن، کن تماشا — ندارد آب و گل این جلوه، حاشا ۱۳۰

نهادِ شان، چو بوی گل، گران نیست — همه جانند و جسمی در میان نیست

خس و خارش، گلستانست، گویی — غبارش، جوهرِ جانست، گویی

چه فروردین، چه دیماه، و چه مرداد — بهر موسم فضایش جنّت آباد

کفِ هر خاکش، از مستی کنشتی — سرِ هر خارش، از سبزی بهشتی

سوادش پای تخت بت پرستان — سراپایش زیارتگاهِ مستان ۱۳۵

درین دیرینه دیرستانِ نیرنگ — بهارش، ایمن است، از گردشِ رنگ

بود در عرضِ بال افشانیِ ناز — خزانش قشقهٔ پیشانیِ ناز

به تسلیم هوای آن چمن زار — ز موجِ گل بهاران بسته زنّار

فلک را قشقه اش گر بر جبین نیست — پس این رنگینیِ موجِ شفق چیست

زیارتخانهٔ ناقوسیانست — همانا کعبهٔ هندوستانست ۱۴۰

بتانش را هیولا شعلهٔ طور — سراپا نورِ ایزد، چشمِ بد دور!

میانها نازک و دلها توانا — ز نادانی بکارِ خویش دانا

تبسم بسکه در لبها طبیعی است — دهنها رشکِ گلهای ربیعی است

ادائی یک گلستان جلوه سرشار — خرامی، صد قیامت فتنه در بار

بلطف، از موجِ گوهر، نرم روتر — بناز، از شوقِ عاشق، گرم دوتر ۱۴۵

قیامت قامتان، مژگان درازان — ز مژگان، بر صفِ دل، نیزه بازان

ز انگیزِ قد، اندازِ خرامی — بپای گلبنی، گسترده دامی

ز تن، سرمایهٔ افزایشِ دل — سراپا مژدهٔ آسایشِ دل

ز رنگین جلوه ها غارتگرِ هوش — بهارِ بستر و نوروزِ آغوش

ز تابِ جلوهٔ خویش آتش افروز — بتانِ بت پرست (و) برهمن سوز ۱۵۰

بسامانِ دو عالم گلستان رنگ — ز تابِ رخ، چراغانِ لبِ گنگ

رسانده از ادای شستشوئی — بهر موجی نویدِ آبروئی

بمستی، موج را فرموده، آرام — ز شوخی، آب را بخشیده، اندام

فتاده شورشی در قالبِ آب — ز ماهی صد دلش، در سینه بیتاب

ز بس عرضِ تمنا میکند گنگ — ز موجِ آغوشها وا میکند گنگ ۱۵۵

ز تابِ جلوه ها بیتاب گشته — گهرها در صدفها آب گشته

مگر گویی، بنارس شاهدی هست — ز گنگش صبح و شام آیینه در دست

بنازِ عکسِ رُوی آن پری چهر — فلک در زر گرفت آیینه از مهر

بنامیزد، زهی حُسن و جمالش! — که در آیینه می رقصد مثالش

بهارستانِ حُسنِ لاابالی است — بکشور ها سمر در بیمثالی است ۱۶۰

به گنگش عکس تا پَرتَو فگن شد — بنارس خود نظیرِ خویشتن شد

چو در آیینهٔ آبش نمودند — گزندِ چشم زخم از وی ربودند

به چین نبود نگارستان، چو اوئی — بگیتی نیست شارستان، چو اُوئی

بیابان در بیابان لاله زارش — گلستان در گلستان نوبهارش

کشیده کلکِ ایجادش در اطراف — عمارت در عمارت، قاف تا قاف ۱۶۵

شبی، پرسیدم از روشن بیانی — ز گردشهای گردون راز دانی

که بینی، نیکوییها از جهان رفت — حیا و مهر و آزرم از میان رفت

ز ایمانها بجز نامی نمانده — بغیر از دانه و دامی نمانده

برادر با برادر در ستیز است — وفاق از شش جهت رُو در گریز است

پدرها تشنهٔ خونِ پسر ها — پسرها دشمنِ جانِ پدر ها ۱۷۰

به این بی پردگیهای علامت — چرا پیدا نمی گردد قیامت

به نفخِ صور تعویق از پیِ چیست — قیامت را عنان گیرِ جنون کیست

سوی کاشی به اندازِ اشارت
تبسم کرد و گفتا: "این عمارت

"که حقا نیست صانع را گوارا
"که از هم ریزد، این رنگین بنارا"

"بلند افتاده تمکینِ بنارس"
"بود بر اوجِ او اندیشه نارس" ۱۷۵

الا، ای غالبِ کار اوفتاده
زچشمِ یار و اغیار اوفتاده

زخویش و آشنا بیگانه گشته
جنون گل کرده و دیوانه گشته

چه محشر سر زد از آب و گلِ تو
دریغا، از تو و آه، از دلِ تو!

چه جوئی جلوه، زین رنگین چمنها
بهشتِ خویش شو، از خون شدنها

جنونت گر به نفسِ خود تمام است
زکاشی تا به کاشان نیم گام است ۱۸۰

چو بوی گل ز پیراهن برون آی
به آزادی ز بندِ تن برون آی

مده از کف طریقِ معرفت را
سرت گردم، بگرد این شش جهت را

فرو ماندن بکاشی نارسائی است
خدا را، این چه کافر ماجرائی است!

ازین دعوی به آتش شوی لب را
بخوان غمنامهٔ ذوقِ طلب را

بکاشی، لختی از کاشانه یاد آر
درین جنت، ازان ویرانه یاد آر ۱۸۵

دریغا، در وطن وا ماندهٔ چند!
بخونِ دیده زورق راندهٔ چند

هوس را پای در دامن شکسته
به امیدِ تو چشم از خویش بسته

بشهر از بیکسی، صحرا نشینان
بروی شعلهٔ دل، جا گزینان

مگر کان قوم را دهر آفریده
زسیماب بر آتش آرمیده

همه در خاک و خون افگندهٔ تو
بحکم بیکسیها بندهٔ تو ۱۹۰

چو شمع از سوز دل آذر فشانان
بزم عرض دعوی بیزبانان

سر و سرمایه غارت کردهٔ تو
ز تو نالان، ولی در پردهٔ تو

از آنانت تغافل خوشنما نیست
بداغ شان، هوای گل روا نیست

ترا ای بیخبر! کاریست در پیش
بیابانی و کهساری است در پیش

چو سیلابت شتابان میتوان رفت
بیابان در بیابان میتوان رفت ۱۹۵

ترا ز اندوه مجنون بود باید
خراب کوه و هامون بود باید

تن آسانی بتاراج بلا ده
چو بینی رنج، خود را رونما ده

هوس را سر ببالین فنا نه
نفس را از دل آتش زیر پا نه

دل از تاب بلا بگداز و خون کن
ز دانش کار نکشاید، جنون کن

نفس تا خود فرو ننشیند از پای
دمی از جاده پیمائی میاسای ۲۰۰

شرار آسا فنا آماده برخیز
بیفشان دامن و آزاده برخیز

ز الّا دم زن و تسلیم لا شو
بگو الله و برق ماسوا شو

مِن غزلیات

(۱)

جنون مستم، بفصلِ نو بہارم میتوان کشتن
صراحی بر کف و گُل در کنارم میتوان کشتن

گرفتم کَی بشرعِ ناز زارم میتوان کشتن
بفتوای دلِ امیدوارم میتوان کشتن

تغافلہای یارم زنده دارد، ورنہ در بزمش
بجُرمِ گریۂ بی اختیارم میتوان کشتن

پس از مردن، اگر بہرِ من آسایش گمان داری
سرت گردم، بتصدیعِ خمارم میتوان کشتن

زخویشان منتِ یک نوحہ می باید کشید آخر
جدا از خانمان، دُور از دیارم، میتوان کشتن

٢.٥

منت معذور دارم، لیکن، ای نامهربان! آخر
بدین جان و دلِ امیدوارم میتوان کشتن

جفا، بر چون منی، کم کن که گر کشتن هوس باشد
بذوقِ مژدهٔ بوس و کنارم میتوان کشتن

بجرمِ این که در مستی، بپایان بُرده ام عمری
بکوی میفروشان، در خمارم، میتوان کشتن

۳۱۰

گرفتم، یار باشد بی نیاز از کشتنم، غالب!
بدردِ بی نیازیهای یارم میتوان کشتن

۲

نمی بینیم در عالم نشاطی کاسمان ما را
چو نور از چشمِ نابینا، ز ساغر رُفت صهبا را

در آغوشِ تغافل عرضِ بیتابی توان دادن
تهی تا میکنی پهلو، بما بنمودهٔ جا را

دلِ مایوس را تسکین، به مردن میتوان دادن
چه امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را!

سرابِ آتش از افسردگی چون شمعِ تصویرم ٢١٥
فریبِ عشقبازی میدهم، اهلِ تماشا را

چه لب تشنه است خاکم، کآستینِ گردبادِ من
چو اشک از چهره، از روی زمین برچید دریا را

سر و کارم بود با ساقیی کز تندیِ خویش
نفس در سینه می لرزد، ز موجِ باده مینا را

مکن ناز و ادا چندین، دلی بستان و جانی هم
دماغِ نازکِ من، بر نمی تابد تقاضا را

خطی بر هستیِ عالم کشیدیم از مژه بستن
ز خود رفتیم و هم با خویشتن بردیم دنیا را

زمین گو نیست، گو مجنون که من بردم ز میدانش ٢٢٠
غبارم در نوردِ خود فرو پیچید صحرا را

ازین بیگانگیها می تراود آشناییها
حیا می ورزد و در پرده رسوا می کند ما را

حذر از زهرِ مهرِ سینهٔ آسودگان، غالب!
چه منتها که بر دل نیست جانِ ناشکیبا را

۳

باہمہ گم گشتگی خالی بود جایم ہنوز — گاہ گاہی در خیالِ خویش می آیم ہنوز

تا سرِ خارِ کدامین دشت در جان می خلد — کز ہجومِ ذوق می خارد کفِ پایم ہنوز

خشک شد چندانکہ مَی جزوِ بدن شد شیشہ را — ہمچنان گویی در انگور است صہبایم ہنوز ۲۲۵

بعدِ مُردن مُشتِ خاکم در نوردِ صرصر است — بیقراری میزند موج از سراپایم ہنوز

تازہ دور افتادہ طرفِ بساطِ عشرتم — میتوان افشرد مَی از لای پالایم ہنوز

صد قیامت در شکنجِ ہر نفس خون گشتہ است — من ز خامی در فشارِ بیمِ فردایم ہنوز

تا کجا یارب! فرو شُست اشکِ من ظلمت ز خاک — لالہ بیداغ از زمین روید بصحرایم ہنوز

چشمم از جوشِ نگہ خون گشت و از مژگان چکید — ہمچنان در حلقۂ دامِ تماشایم ہنوز ۲۳۰

با تغافل بر نیامد طاقتم لیک از ہوس — در تمنّای نگاہِ بی محابایم ہنوز

ہمرہان در منزل آرامیدہ و غالب ز ضعف
پا برون نا رفتہ از نقشِ کفِ پایم ہنوز

۴

ای بصد مۂ آہی بر دلت ز ما باری — اینقدر گران نبود نالۂ ز بیماری

وہ کہ با چنین طاقت، راہ بر دمِ تیغ است — پای بر نمی تابد رنجِ کاوشِ خاری

در جنون بمن مانا است، گر ز عجز خون گردد — نالہ کہ بر خیزد، از دلِ گرفتاری ۲۳۵

غم چہ در ربود از ما؟ اینک آنچہ بود از ما — سینۂ و اندوہی، خاطری و آزاری

ای فنا! دری بگشا، بو که در تو بگریزد — هم ز خلق نومیدی، هم ز خویش بیزاری

بهره از وجودم نیست، زین کشش کشودم نیست — پا و داغِ رفتاری، دست و حسرتِ کاری

بر جنون صلائی زن، عقل را قفائی زن — داده زنامردی، سر به بندِ دستاری

نازِ مومن و کافر، بر چه دستگاه آخر! — سُبحه و مسواکی، قشقه و زُنّاری ۲۴۰

کاش، کان بُتِ کاشی در پذیردم، غالب!
"بندهٔ توام" گویم؛ گویدم زنار: "آری"

۵

شبهای غم که چهره بخوناب شسته ایم — از دیده، نقشِ وسوسهٔ خواب شسته ایم

افسونِ گریه بُرد زخُویت عتاب را — از آتشِ تو دُودِ بهفت آب شسته ایم

زاهد! خوش است صحبت، از آلودگی مترس — کاین خرقه بارها به میِ ناب شسته ایم

بیدست و پا به بحرِ توکّل فتاده ایم — از خویش گردِ زحمتِ اسباب شسته ایم ۲۴۵

ای در عتاب رفته ز بیرنگیِ سرشک — غافل که امشب از مژه خوناب شسته ایم

غرقِ محیطِ وحدتِ صرفیم و در نظر — از رُوی بحر موجه و گرداب شسته ایم

غالب! رسیده ایم به کلکته و به می
از سینه داغِ رحلتِ نواب شسته ایم

(۶)

این چه شور است که از عشقِ تو در سر دارم | ذوقِ پروانه و تمکینِ سمندر دارم
آبم از پردهٔ دل، بی تو، شرر می بیزد | شیشه لبریزِ می و سینه پُر آذر دارم ۲۵۰
ای متاعِ دو جهان رنگ بعرض آورده | هان، صلائی که ازین جمله دلی بردارم
من وحشتی که، بخورشیدِ قیامت گرم است | تکیه بر داوریِ عرصهٔ محشر دارم
آن چرا در تعب و این ز چه ره در طرب است | خنده بر غفلتِ درویش و توانگر دارم
کیست تا خار و خس از رهگزرش بردارد | دگر امشب سرِ آرایشِ بستر دارم
پرتوِ مهر، سیاهی ز گلیمم نبرد | سایه ام، سایهٔ شب و روز برابر دارم ۲۵۵
سوخت دل، بیتو، ز وصلم چه کشاید اکنون | حسرتت بیشتر و ذوقِ تو کمتر دارم
رازدارِ تو و بدنامِ کنِ تقدیرم | هم سپاس از تو و هم شکوه ز اختر دارم

مرحبا، سوہن و جان بخشیِ آبش، غالب!
خنده بر گمرہیِ خضر و سکندر دارم

(۷)

گویم سخنی، گرچه شنیدن نشناسد | صبحی است شبم را که دمیدن نشناسد
از بند چه بکشاید، و از دام چه خیزد | مائیم و غزالی که رمیدن نشناسد ۲۶۰
ساقی چه شگرفی کند، و باده چه تندی | خون باد دماغی که رسیدن نشناسد
ما لذّتِ دیدار ز پیغام گرفتیم | مشتاقِ تو دیدن ز شنیدن نشناسد

بینم چه بلا بر سرِ جیب کفن آرد — دستی که بجز جامه در یدن نشناسد
پیوسته روان از مژه خونِ جگرِ ستم — رنگیست زخم را که پریدن نشناسد
شوقم میِ گلگون بسبو میزند امشب — پیمانه ز ساقی طلبیدن نشناسد ۵
گوهر چه شکایت کند از بی سروپائی — داریم سرشکی که چکیدن نشناسد

با لذتِ اندوهِ تو در ساختهٔ غالب
گویی همه دل گشت و تپیدن نشناسد

(۸)

به عشق از دو جهان بی نیاز باید بود — مجاز سوزِ حقیقت گداز باید بود
بجیبِ حوصله نقدِ نشاط باید ریخت — بجانِ شکوهٔ تغافل طراز باید بود
چو لب ز زمزمه نوایانِ شوق نتوان شد — چو دل ز نغمه سرایانِ راز باید بود ۲۰
چو بزمِ عشرتیان تازه رو توان جوشید — چو شمعِ خلوتیان جان گداز باید بود
بصحنِ میکده ها مست میتوان گردید — بکنجِ صومعه ها در نماز باید بود
چو شوق بال کشاید بخود توان بالید — چو ناز جلوه نماید نیاز باید بود
بخون طپیدهٔ ذوقِ نگاه نتوان زیست — شهیدِ آن مژه های دراز باید بود
کمر نهفته بتاراجِ خویش باید بست — شریکِ مصلحتِ سعیِ ناز باید بود ۲۵

نگہ ز دیدۂ بیدار جو کہ سائل را بگدیہ طالبِ درہای باز باید بود
چہ برز راحتِ آزادگی خوری غالب!
ترا کہ این ہمہ با برگ و ساز باید بود

(۹)

از وہمِ قطرگیست کہ در خود گمیم ما اما چو وارسیم، ہمان قلزمیم ما
در خاک از ہوای گل و شمع فارغیم از توسنِ تو طالبِ نقشِ سُمیم ما
مردم بکینہ تشنۂ خونِ ہم اند و بس خون میخوریم، چوں ہم ازیں مردمیم ما
از حد گزشت شملۂ دستار (و) ریشِ شیخ حیرانِ این درازیِ یال و دمیم ما
تمکینِ ما ز چرخِ سبکسر، بباد رفت خوش دستگاہِ انجمنِ انجمیم ما
پنہان بہ عالمیم ز بس عینِ عالمیم چون قطرہ در روانیِ دریا گمیم ما
مارا مدد، ز فیضِ ظہوری ست، در سخن چون جامِ بادہ، راتبہ خوارِ خمیم ما
غالب ز ہند نیست نوائی کہ می کشیم
گویی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

(۱۰)

آنان کہ وصلِ یار ہمی آرزو کنند باید کہ خویش را بگداز ندو او کنند
وقتست، کز روانیِ می، ساقیانِ بزم پیمانہ را حبابِ لبِ آبجو کنند

مینائی از نیِ کہ بناخن شکستہ اند ایوای، ناخنی بدلت گر فرو کنند!

لب تشنہ جوی آب شمارد سراب را میزیبد ار بہستیِ اشیا غلو کنند

آیندہ خونِ خلق بگردن گرفتہ اند آنان کہ گفتہ اند: نکویان نکو کنند ۲۹۰

ازبس بشوقِ روی تو مست است نوبہار بوی می آید ار دہنِ غنچہ بو کنند

دیوانہ وجہِ رشتہ ندارد، مگر ہمان تاری کشد زجیب کہ چاکی رفو کنند

پیمانہ را بماتمِ صہبا نشاندنست ایوای، گر زخاکِ وجودم سبو کنند!

آلودۂ ریا نتوان بود، غالبا!
پاک است خرقہ، کہ بمی شست و شو کنند

(۱۱)

بگیتی شد عیان از شیوۂ عجز، اضطرارِ ما ۲۹۵
زپشتِ دستِ ما باشد قماشِ روی کارِ ما

بہ بیم افگندہ می را، چارۂ رنجِ خمارِ ما
قدح برخویش میلرزد، زدستِ رعشہ دارِ ما

خوشا جانی کہ، اندوہی فرو گیرد سراپایش!
زنومیدی توان پرسید، لطفِ انتظارِ ما

فروزد ہر قدر رنگِ گل، افزاید تب و تابش
کبابِ آتشِ خویش است، پنداری، بہارِ ما

نشستن، بر سرِ راہِ تحیّر، عالمی دارد
کہ ہر کس میرود، از خویش، میگردد دوچارِ ما

ہنوز از مستیِ ذوقِ تو می بالد تماشائی
بموجِ بادہ ماند پرتوِ شمعِ مزارِ ما

چو بوی گل جنون تازیم، از مستی، چہ می پرسی
گسستن دارد، از صد جا، عنانِ اختیارِ ما

حریفانِ شورشِ عشقِ تُرابی پردہ دیدندی
بدا ما، گر نہ گشتی موسمِ گل، پردہ دارِ ما!

بدین تمکین حریفِ دستبردِ نالہ نتوان شد
بود سنگِ فلاخن مر صدا را کوہسارِ ما

خوشا آوارگی، گر در نوردِ شوق بربندد
بتارِ دامنی شیرازۂ مشتِ غبارِ ما

بدین یک آسمان دُردانہ می بینی، نمی بینی
کہ ماہِ نَو، شد از سُودن، کفِ گوہر شمارِ ما

نهالِ شمع را بالیدن از کاهیدنست اینجا
گدازِ جوہرِ ہستی است غالب! آبیارِ ما

(۱۲)

گاہی بچشمِ دشمن و گاہی در آینه
پُر کارِ عیب جوئیِ خویشم ہر آینه

تا خود دلِ که جلوه گہِ رُوی یار شد
خنجر بخویش می کشد از جوہر آینه

دردا که دیده رانمِ اشکی نمانده است!
کاندر وداعِ دل، زندآبی، بر آینه

باشد که، خاکساریِ ما بر دہد فروغ
گویی ہسپرده ایم به روشنگر آینه ۳۱۰

محوِ خودی و دادِ رقیبان نمی دہی
ای بر رُخت، ز چشمِ تو حیران تر آینه

دُورت ربوده ناز، بخود ہم نمی رسی
تا چند، در ہوای تو ریزد بہ بَر آینه!

در ہر نظر، برنگِ دگر جلوه می کنی
حُسنت طلسمِ فتنه و افسونگر آینه

حیرت نصیب دیده، زبیتابیِ دل است
سیماب را حقی است، ہمانا بر آینه

ہر یک گدای بوسه و نظّاره کسی است
از جم پیاله بین و ز اسکندر آینه ۳۱۵

غالب! خطر ز آب بود، سگ گزیده را
مردم گزیده ز آینه ترسد، ہر آینه

(۱۳)

جیبِ مرا مدوز که پُودش نمانده است
تارش زہم گسسته و پُودش نمانده است

سرگرمیِ خیالِ تو از ناله باز داشت
دل پاره آتشی است که دودش نمانده است

داد از تظلّمی که بگوشت نمی رسد!
آه از توقعی که وجودش نمانده است

دل جلوه میدهد هنرِ خود در انجمن
رحمی مگر بجانِ حسودش نمانده است ۳۲۰

افتادگی، نمازِ دلِ ناتوانِ ماست
دردِ سرِ قیام و قعودش نمانده است

دل را بوعده ستمی می توان فریفت
نازی که بر وفای تو بودش نمانده است

چون نقطهٔ اخترِ سیه از سیر باز ماند
گویی، دگر هبوط و صعودش نمانده است

مکتوبِ ما بتارِ نگاهِ تو عقده ایست
کز هیچ رو امیدِ کشودش نمانده است

غالب زبان بریده و آگنده گوش نیست ۳۲۵
امّا دماغِ گفت و شنودش نمانده است

(۱۴)

نگاهش ار بسرِ نامهٔ وفا ریزد
سوادِ صفحه ز کاغذ چو توتیا ریزد

بفرقِ ما، اگرش ناگهان گزار افتد
چو گرد، سایه ز بال و پرِ هما ریزد

خوشا بریدنِ راهِ وفا که در هر گام
جبین ز پای باندازِ نقشِ پا ریزد!

دماغِ ما، ز بلا میرسد، مگر ساقی
گدازِ زهرهٔ ما، در ایاغِ ما ریزد

خوش آنکه عجزِ منش بر سرِ عتاب آرد
خسک به پیرهنِ شعلهٔ جفا ریزد ۳۳۰

بهشتِ خویش توانی شدن، اگر داری
دلی که، خون شود و رنگِ مدعا ریزد

شباب و زہد، چه ناقدردانیِ ہستی است! بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد

بروزِ وصل، در آغوشم آنچنان بفشار که بی من، از لبِ من شکوهٔ تو وا ریزد

بسجده بر درِ یار او فتیم، تا غالب

خطِ جبین چو غبار از جبینِ ما ریزد

(۱۵)

بخود رسیدنش از ناز بسکه دشوار است چو ما، بدامِ تمنّای خود گرفتار است ۳۳۵

تمام زحمتم، از ہستیم چه می پرسی! ز جسمِ لاغرِ خویشم، به پیرہن خار است

صلای قتل ده و جانفشانیِ ما بین برای کشتنِ عشّاق، وعده بسیار است

ستم کشِ سرِ ناموس جوی خویشتنم که تا ز جیب بر آمد به بندِ دستار است

بشب حکایتِ قتلم ز غیر می شنود ہنوز فتنه بذوقِ فسانه بیدار است

بقامتِ من، از آوارگیست پیرہنی که خارِ رہگزرش پود و جاده اش تار است ۳۴۰

غمم شنیدن و لختی بخود فرو رفتن خوشا فریبِ ترحّم، چه ساده پرکار است!

بیا که فصلِ بہار است و گل بصحنِ چمن کشاده روی تر از شاہدانِ بازار است

فنا است ہستیِ من، در تصورِ کمرش چو نغمهٔ که ہنوزش وجود در تار است

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست به گردِ نقطهٔ ما دورِ ہفت پرکار است

نگاه خیره شد از پرتوِ رخش، غالب!
تو گویی، آینۀ ما سراب دیدار است

(۱۶)

امشب آتشین رویی، گرمِ زنده خوانیهاست — کز تبش نوا هر دم، در شرر فشانیهاست
تا در آب افتاده عکسِ قدِ دلجویش — چشمه، همچو آیینه، فارغ از روانیهاست
کشتۀ دلِ خویشم، کز ستمگران یکسر — دیده، دلفریبیها؛ گفته، مهربانیهاست
در کشاکشِ ضعفم، نگسلد روان از تن — اینکه من نمی‌میرم، هم ز ناتوانیهاست
شوخیش در آیینه، محوِ آن دهن دارد — چشمِ سحر پردازش، بابِ نکته دانیهاست ۳۵۰
از خمیدنِ پشتم، روی بر قفا باشد — تا چها درین پیری، حسرتِ جوانیهاست
با چنین تهیدستی، بهره چه بود از هستی — کارِ ما ز سرمستی، آستین فشانیهاست
دانم از سر خاکم، رخ نهفته بگذشتن — ای تو و خدای تو این چه بدگمانیهاست!
سوی من نگه دارد، چین فگنده در ابرو — با گران رکابیها، خوش سبک عنانیهاست
با عدو عتابستی، وز منش حجابستی — وه چه دلربائیها، هی چه جانستانیهاست! ۳۵۵
ایکه اندرین وادی، مژده از هما دادی — بر سرم ز آزادی، سایه را گرانیهاست

ذوقِ فکرِ غالب را، برده ز انجمن بیرون
با ظهوری و صائب محوِ همزبانیهاست

(۱۷)

ز گرمیِ نکہت، خونِ دل بجوش آمد | زشادیِ ستمت سینہ در خروش آمد
بجان نوید کہ شرم از میانہ ہم رفت! | بعیش مژدہ کہ وقتِ وداعِ ہوش آمد!
شہیدِ چشمِ توگشتم کہ خوش سخن گوی ست | ہلاکِ طرزِ لبم شو کہ پُر خموش آمد ۳۶۰
ز وصلِ یار قناعت کنون بہ پیغامی ست | خزانِ چشم رسید و بہارِ گوش آمد
زمامِ حوصلہ نگرفت و کوہکن جان داد | چہ نرم شانہ گزشت و چہ سخت کوش آمد
ترا جمال و مرا مایۂ سخن سازی ست | بہار زینتِ دوکانِ گُل فروش آمد
بہ آستین بفشان و بہ تیغ خویش بردار | کہ جان غبارِ تن و سر وبالِ دوش آمد
فدای شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار | بعذر خواہیِ رندانِ بادہ نوش آمد ۳۶۵
خیالِ یار در آغوشم آنچنان بفشرد | کہ شرم امشبم از شکوہ ہای دوش آمد

مپرس وجہِ سوادِ سفینہ ہا، غالب!
سخن بمرگِ سخن رس سیاہ پوش آمد

(۱۸)

طاق شد طاقت ز عشقت، بر کران خواہم شدن
مہربان شو، ورنہ بر خود، مہربان خواہم شدن
در تب اند از تابِ رشکِ طاقتِ نظارہ ام
خوش بیا، کامشب بہشتِ دشمنان خواہم شدن

محو گشتم در تغافل، برنتابم التفات ۲۷۰
گر بچشمم جا دهی، خوابِ گران خواهم شدن

پیشِ خود بسیارم و بسیار مشتاقِ توام
تا کجا صرفِ گدازِ امتحان خواهم شدن

آبم از شرمِ وفا و از خودم پا در گل است
تا نه پنداری که از کویت روان خواهم شدن

فکرِ معنی های نازک بسکه می کاهد مرا
شاهدِ اندیشه را موی میان خواهم شدن

با هوس خویش است حسن و از وفا بیگانه است
مهر کم کن، ورنه بر خود بدگمان خواهم شدن

گرم باد از نغمهٔ بزمِ دعوتِ بالِ هما ۲۷۵
سازِ آوازِ شکستِ استخوان خواهم شدن

خار و خس، هرگه در آتش سوخت، آتش میشود
مُردم از ذوقِ لبت چندان که جان خواهم شدن

لذتِ دردم چو خون، غالب! در اعضا میدَوَد
رنج گر اینست، راحت را ضمان خواهم شدن

(۱۹)

خوش بود، فارغ ز بندِ کفر و ایمان، زیستن
حیف، کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن!

شیوهٔ رندانِ بی پروا خرام، از من مپرس
اینقدر دانم که، دشوار است آسان زیستن

راحتِ جاوید، ترکِ اختلاطِ مردم است ۳۸۰
چون خضر، باید، ز چشمِ خلق، پنهان زیستن

بُرد گوی خرمی از هر دو عالم هر که یافت
در بیابان مُردن و در قصر و ایوان زیستن

بر نویدِ مَقدمت، صد بار جان باید فشاند
بر امیدِ وعده ات، زنهار، نتوان زیستن!

تا چه راز اندر تهِ این پرده پنهان کرده اند
مرگ مکتوبی بود، کاو راست عنوان زیستن

روزِ وصلِ یار، جان دِه، ورنه عمری بعد ازین
همچو ما، از زیستن، خواهی پشیمان زیستن

ابتذالی دارد این مضمون، توارد عیب نیست ۳۸۵
نگذرد در خاطرِ نازک خیالان زیستن

با رقیبان هم فنیم، امّا بدعویٰ گاہِ شوق
مردن است از ما وزین مشتی گرانجان زیستن

نیست گر بزمِ نشاطی، ہان بیابان کردئی
فاش گویم باتو، تا ہنگامہ نتوان زیستن

غالب! از ہندوستان بگریز، فرصت مفتِ تُست
در نجَف مُردن خوش است و در صفاہان زیستن

(۲۰)

تا کیم دُودِ شکایت ز بیان برخیزد
بزن آتش کہ شنیدن ز میان برخیزد

گردہم شرحِ عتابی کہ بدلہا داری
دُود از کارگہِ شیشہ گران برخیزد ۳۹۰

زینہار از تعبِ دوزخِ جاوید منال
خوش بہاریست کز و بیمِ خزان برخیزد

نالہ برخاست دمِ جستن از آتش ز سپند
گوشگرفی کہ چو ما از سرِ جان برخیزد

بچہ گیرند عیارِ ہوس و عشق دگر
رسمِ بیداد مبادا ز جہان برخیزد

ہمدم از شور و فغانم چہ بستوہ آمدہ
باش تا بختِ من از خوابِ گران برخیزد

کشتۂ دعویِ پیدائیِ خویش اند ہمہ
وای گر پردہ ازین رازِ نہان برخیزد ۳۹۵

میرمی از من و خلقی بگمانست ز تو
نہ بجا باش و بنشین کہ گمان برخیزد

جُزوی از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو مُوئی کہ بتان را ز میان برخیزد

عمرها چرخ بگردد که جگر سوخته‌ای — چون من از دودهٔ آزر نفسان برخیزد
گرد هم شرحِ ستم های عزیزان، غالب!
رسم امید همانا ز جهان برخیزد

(۲۱)

بشغلِ انتظارِ مهوشان، در خلوتِ شب‌ها — سرِ تارِ نظر شد رشتهٔ تسبیحِ کوکب‌ها ۴۰۰
کند گر فکرِ تعمیرِ خرابی های ما گردون — نیاید خشت، مثلِ استخوان، بیرون ز قالب‌ها
بخلوتخانهٔ کامِ نهنگِ لا زدم خود را — ستوه آمد دل، از هنگامهٔ غوغای مطلب‌ها
ندارد حسن از مشاطگی های خودش غفلت — بود ته بندیِ خط سبزهٔ خط در تهِ لب‌ها
بروی برگِ گل تا قطرهٔ شبنم نه پنداری — بهار از حسرتِ فرصت بدندان میگزد لب‌ها
مبادا همچو تارِ سبحه از هم بگسلد، غالب ۴۰۵
نفس با این ضعیفی بر نتابد شورِ یارب‌ها

(۲۲)

خوش وقتِ اسیری که بر آمد هوسِ ما — شد روزِ نخستین سبدِ گل قفسِ ما
مهتاب نمکسار بود، بادهٔ ما را — ای نیمرهٔ بی رُوی تو، بزمِ هوسِ ما
وقتست که خونِ جگر از ناله بجوشد — چندان که چکد از مژهٔ دادرسِ ما
ای بیخبر از مستی و ذوقِ فراغش! — در پیرهنِ ما نبود خار و خسِ ما

در دہر فرو رفتۂ لذت نتوان بود — بر قند نشست است ہمانا مگس ما ۴۱۰

حیرت زدۂ جلوۂ نیرنگ خیالیم — آیینہ مدارید بہ پیش نفس ما

طول سفر شوق چہ پرسی کہ درین راہ — چون گرد فرو ریخت صدا از جرس ما

خرسندی غالب نبود زین ہمہ گفتن
یک بار بفرمای کہ ای ہیچکس ما!

۲۳

از تست اگر ساختہ پرداختۂ ما — کفری نبود مطلب بی ساختۂ ما

پروردۂ نازیم بہ رحمت کدۂ عجز — بر پای تو باشد سر افراختۂ ما ۴۱۵

ہمطرحی سودازدگان تو بلا شد — کاشانۂ اغیار برانداختۂ ما

حیرانی ما آینۂ شہرت یار است — شد جادہ بجویش نگہ باختۂ ما

وقتست کہ چون گرد ز تحریک نسیمی — ریزد پر و بال از قفس فاختۂ ما

ہر جادہ کہ از نقش پی تست بگلشن — چاکی است بجیب ہوس انداختۂ ما

غالب! مدم افسون اقامت کہ بلائیست ۴۲۰
دیوانۂ از بند برون تاختۂ ما

(۲۴)

جنون، از بس بصحرای تحیّر رانده است امشب
نگه در چشم و آهم در جگر، وا مانده است امشب

خیال وحشتم، از ضعفِ دل، صورت نمی بندد
بیابان، بر نگه، دامانِ ناز افشانده است امشب

بقدرِ شامِ هجرانش، درازی باد عمرش (را)
فلک نیز از کواکب سُبحه ها گردانده است امشب

دل از من عاریت جستند اہلِ لاف و دانستم
سمندر این غریبان را بدعوت خوانده است امشب

خوش است افسانهٔ دردِ جدائی مختصر، غالب!
بمحشر میتوان گفت، آنچه در دل مانده است امشب ۴۲۵

(۲۵)

چه فتنه ها که در اندازهٔ گمانِ تو نیست
قیامت است دلِ دیر مهربانِ تو نیست

فریبِ آشتیِ ده، ظفر مبارک باد
دلِ ستم زده در بندِ امتحانِ تو نیست

دلم بعهدِ وفای فریفت نامه برت
خوش است وعدهٔ تو گرچه از زبانِ تو نیست

نه من ز آهن و سنگم که ریزدت دمِ تیغ
بکُش مترس که در سودِ من زیانِ تو نیست

دل از خموشیِ لعلت امیدوار چرا است!
چه گفته به زبانی که در دهانِ تو نیست؟ ۴۳۰

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی | بدست مرگ، ولی بدتر از گمانِ تو نیست
شکستِ رنگِ تو از عشق خوش تماشائیست | بهارِ دهر به رنگینیِ خزانِ تو نیست
شباهتی است مرا زآنکه بر نیامده است | دگرنه موئی بباریکیِ میانِ تو نیست

تغافلِ تو دلیلِ تجاهل افتاد است
تو و خدای تو غالب ز بندگانِ تو نیست؟

(۲۶)

داغم از پردهٔ دل رو بقفا می آید | تا به بینم که ازین پرده چها می آید ۴۲۵
همچو رازی که به مستی ز دل آید بیرون | در بهاران همه بویت ز صبا می آید
زیستم بی تو وزین ننگ نه کشتم خود را | جان فدای تو میا، کز تو حیا می آید
بچه کار آیدت، ای شیخ! گر آتش نزنی | بوریائی که ازو بوی ریا می آید
دعویِ گم شدگی محضرِ رسوائی هاست | تا پیِ مور به ویرانهٔ ما می آید
راز از سینه بمضراب نریزیم برون | سازِ عاشق ز شکستن بصدا می آید ۴۳۰
برگِ گل پردهٔ ساز است تمنای ترا | بو که دریافته باشی چه نوا می آید
درهم افشردنِ اندامِ تو چون بانیخواست | خنده بر تنگیِ آغوشِ قبا می آید
رفته، در حسرتِ نقشِ قدمی، عمر بسر | جادهٔ را که بسر منزلِ ما می آید

اتفاقِ سفر افتاده به پیری غالب!
آنچه از پای نیامد ز عصا می آید

(۲۷)

بیا و جوشِ تمنای دیدنم بنگر
چو اشک از سرِ مژگان چکیدنم بنگر ۴۴۵

زمن، بجرمِ طپیدن، کناره می کردی
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

گزشته کارِ من از رشکِ غیر، شرمت باد
ببزمِ وصلِ تو خود را ندیدنم بنگر

اگر هوای تماشای گلستان داری
بیا و عالمِ در خون تپیدنم بنگر

شنیده ام که نه بینی و نا امید نیم
ندیدنت بشنیدم، شنیدنم بنگر

دمید دانه و بالید و آشیانه شد
در انتظارِ کسی دام چیدنم بنگر ۴۵۰

نیازمندیِ حسرت کشان نمیدانی
نگاهِ من شو و دزدیده دیدنم بنگر

جفای شانه که تاری گسسته زان سرِ زلف
ز پشتِ دست بدندان گزیدنم بنگر

بدادِ من نرسیدی ز درد جان دادم
بدادِ طرزِ تغافل رسیدنم بنگر

بهارِ من شو و گل گل شگفتنم دریاب
بخلوتم بَرو ساغر کشیدنم بنگر

فروتنی نکنم بی تواضعی، غالب!
بسایهٔ خمِ تیغش، خمیدنم بنگر ۴۵۵

خاتمه

شبی که سوادِ این گوهرین نامه بپایان رسید و اندیشهٔ لاابالی خرام از تگ و تاز آسود، خامه از کف چون آه از دل برون جست، و سر بربالین چون داغ بسینه جا گزید. غنودگی بهجوم آورد و ربودگی دست بهم داد. ناگاه نظاره سوز برقی از پردهٔ خیالِ شبگیر نگاه بدرخشید و نورانی پیکری از نقابِ غبار رفتنِ هوش جلوه کرد. چشمی چون جادو نگهبانِ صحرانشین بی سرمه سیاه، و رخی چون پریچهرگانِ روستا بی غازه رنگین، گردن و گوش از زیور و پیرایه تهی، ولب و چشم از تبسم و نگاه پُر، قدی باندازهٔ همتِ خودش بلند، و طرّه باندازِ روزگارِ منش پریشان، با جبینی چون گلِ خودرو شگفته و خرامی چون سیلِ بهاری بی پروا، زلفِ دراز از سرمستیِ ناز در پاکشان، نقاب از رخ برافگنده و لب گزان حریفانه در رسید و ستم ظریفانه درآمیخت. لختی منشم را بفشارِ تبسم گوش بمالید، و پارهٔ روشم را بادای تعریض بستود و گفت: خه خه، ای غالبِ نازک‌خیال نوآیین رقم! و ای شاعرِ جادوبیانِ دلکش سخن! ای در نسب از گرانمایگانِ عالمِ ایجاد! و ای در حسب از بیسر و پایانِ چارسوی وجود! ای از سبکسری بدعوی فراخاسته، و از تهیدستی بخاک فرونشسته! هنگامِ آن فراز آمد که از تنک مایگی ها رسوا شوی و سواد از صفحه بموجِ خوی خجلت فروشویی. گفتم: ای آشنا روی بیگانه خو! کمر بکینم بستن، از چه راه و لب بسرزنش گشودن از چه رو؟ مرا در نظرها سبک ساختن یعنی چه؟ و خود را بردل گران کردن آخر چرا؟ کاش دانمی که کیستی و از کجائی و چندین خم آلوده بزن تاختهٔ

بجنبشِ نسیمِ نفسم غنچهٔ نیم[13] شگفته اش صد چمن گل بالید و لبِ تبسم آلودش یک سحرستانِ خنده بجیب و دامانِ تماشا فروریخت. نیسانِ مردمی طوفان کرد و گوشِ خرد[14] را صدفِ گوهرِ این راز گردانید که ای بسرور آمدهٔ گریوهٔ بیخودی و از پا افتادهٔ مغاکِ نادانی[15]! من شخصِ استعدادِ تو ام، به آشتی آمده ام[16] نه بجنگ، بمهر برخاسته ام[17] نه بکین. ملائمتم انجمن سازِ سلامت است[18] و شکایتم آیینه پردازِ هدایت. عمریست که نظارگیِ مرآتِ خیالِ تو ام و شانه کشِ کاکلِ اسرارِ خویش. قدسی پیکرِ خرد[19] فریب مرا پیراهن از تست، و گرامی اندیشهٔ زور آزمای ترا تنومندی از من. شکوه ام از بی پروائیهای[20] تست و سپاس از گرانمایگی های[21] خویش. شکرم از فراوانیِ گنجینهٔ خویش است و شکایت از باردستی های تو[22]. کاروانِ کاروان تنگِ شکرت به یغما میفرستم[23] و دامن دامن لعل و گهرت رایگان میدهم[24]. تو و خدای[25]! تو[26] از پهلوے من آنقدر[27] سرمایه نیندوختهٔ که سوادِ نثری روشن توان[28] کرد و طرحِ انشائی توان[29] ریخت. اید ون خاتمهٔ این مجموعه را به نوردِ کدام عبارت خواهی برآراست و دامنِ این شاهدِ رعنا را به نقش و نگارِ کدام نثر طراز خواهی بست. من[30] پیوسته مشت مشت گلِ همیشه بهارِ معنی بدامنت میریزم. خواهی آنرا بتارِ رشتهٔ نظم گلدسته بند، خواهی همچنان پراگنده بگریبانِ نثر افشان. از نوازشِ نفسِ آشنا بناله در آمدم و بزخمه ریزیِ مضرابِ پرورش چون نغمه از پرده بدر افتادم. تا نگاهِ عجز بی زبانِ گزارشِ مدعای بیخودی شد و نوای دردی از سازِ شکسته دل[31] بدین آهنگ بالید که ای عینِ ثابتهٔ مرا مردمِ چشم و ای کالبدِ اندیشهٔ مرا روانِ گویا! ای شکستگی های مرا مومیائی و ای خستگی های مرا جان دارو! ای برافروزندهٔ[32] گوهرِ آبای من و ای برافرازندهٔ[33] لوای شهرتِ خویش! چندین برقِ چشم مگیر و آبم در انجمن مریز. زخمِ جگر[34] را نمک سودِ ستم مساز و نیم گداخته دل را بناخنِ جفا مکاو. بگرانپائیِ خواهش و سبکخیزیِ شوق، بخاک نشینیِ امید و بال افشانیِ آرزو، بگرانجانیِ ابرام و سبکروحیِ[35] استغنا، بخون گرمیِ اشک و هم سردیِ آه، بزود میریِ شرار و بدیرپائیِ داغ، بزمین گیریِ خاک و باوج گرائیِ غبار، بدلربائیِ لذتِ بی سببِ آزاریِ دوست و بجانگزائیِ اندازِ غمخواریِ دشمن، بفراخیِ

خوانِ الوانِ نعمتِ تو و بہ تنگیِ حوصلۂ اشتہای من، بنالہای[36] با نارسائیِ عہدِ خویشی استوار بستہ از اثرِ بیگانۂ من و بخاطرِ در رحم بہانہ جوی از شرمِ بی اثریہای نالۂ مہربانِ تو کہ تیرگیِ سوادِ نثر نہ از آں روست کہ لمعۂ حسنِ نظر فروزت[37] جلوہ از آن آیینہ زار دریغ داشتہ باشد، بلکہ درین مدت ہرچہ از آن عالم بر من عرض کردہ اند، اگر بتاراجِ پراگندگی ندادمی[38]، گزین نامہا گرد آمدی و سترگ نگاشتہا[39] فراہم گشتی. باری، اگر رفتہ، ذوقِ نمایشِ خود و ربودۂ آزِ[40] ستایشِ یاران بودۂ از تندی فرود آی و بہ فرازِ جای بینش بیارام، تا ورقی دو از نثر در صنعتِ تعطیل عرضہ دہم کہ در کمینگاہِ ہر لفظش جای نقطۂ انتخاب خالی یابی و در نوردِ ہر سطرش چار بالشی برای مردمِ چشم تماشا آمادہ بینی. ہمانا سوادِ چشم نگرانی ست زنگارِ داغِ مردمک از آیینۂ خویش زدودہ یا بیاضِ عارضِ نوخطی است[41] از نقشِ وجودِ خالِ سادہ. حاشا کہ نامہ گرد آور در پیچ و تابِ ہرچہ رفت، بساطِ داوری آراستہ باشد، یا در نوردِ ہرچہ خواہد گفت، عرضِ تحملِ دودمانِ خویش بسیچد. اما پہنای سخن را نشیب و فرازیست کہ اگر گزارندہ آن را فرو گزارد، خرامشِ گفت از پرگار افتد و اندازِ بیان بی سر و بُن گردد. فرد:

بیراہہ اگر گام زنم، خوردہ مگیرید
در عربدہ راہم ز درازیست بہ پہنا

کوتاہیِ سخن، روزی بود و روزگاری کہ بفضای جنتکدۂ دہلی بال افشان بودم و سر نبشتِ آرامیدگی از سطرِ تبسمِ صبحِ وطن میخواندم. نہ بر چہرۂ من از روزگار گردی، و نہ در دلِ سپہر از من غباری. داستانہای داستانیان[42] بگوشِ قبول نشنودمی و از دیو افسانہای طاماتیان برکران بودمی، فرصت را غنیمت دانستمی و بہوای دل رفتمی، چندانکہ توانستمی. ناگرفت گیتی آشوب غمی بہم بر آمد و آفاق سوز جنونی از پردہ سر بدر زد. دل از آسودگی بر آشفت و رای از نشستن برخاست. ذوقِ کاوشِ خارِ صحرا کفِ پایم خارید، و شوقِ آوارگی از شش جہت آغوش بروی دل کشود. ناچار نخست بعزمِ زمین بوس

عمِ مغفور خلد آہنگ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ
بپای تختِ آن مرزبان بار ای و فرہنگ کہ جنوب رویۂ دہلی بچہل کروہی واقع است[۴۴]،
پای خاکی کردم۔ از بسکہ سراسیمگی سراپای دل را فرو گرفتہ بود، از بزرگانِ وطن پدرود ناشدہ
براہ افتادم۔ ہر چند از ان مردم شرمندۂ مہر و وفائی نبودم کہ در حسرتِ فوتِ فرصتِ تودیع
پشت دستی بدندان بایستی گزید، لیکن پارسا گوہر دوستی و آشنا پرور یاری داشتم، چون من
بر من مہربان، و چون دل در سینہ جاگزین، پشتِ خرد را پناہ، و بازوی دانش را نیرو،
رسائی از و در بالیدن و آگاہی از و در نمو، زود پیوند دیر گسل، سر بزرگِ کوچک دل،
مستغرقِ تماشای جمالِ وجہ مطلق مولوی حافظ محمد فضل حق کہ از وی دستوری ناخواستہ
سفر کردن بمذاقِ شوقم ناگوار افتاد و معہذا میانۂ من و اُو شکر آبی نیز بود۔ دل بدرد آمد و جان
بیغمای اندوہ رفت۔ چون کاروان بمنزل رسید و رہرو از رنج راہ برآسود، کتابتے
در صنعتِ تعطیل بخدمتش فرستادہ شد، و سوزش و پوزش را بہم آمیختہ بدین رنگ سخن
گزاردہ آمدہ۔

ھذا[۴۵]

عالمِ اعلم و عالمِ علم، عالمِ عامل و عاملِ عادل، در علمِ[۴۶] علَم و در عمل سمر دام اکرامہ، ط
آلودۂ عالم عالمِ دردِ دل، اسداللہ، سلامِ معمول الاسلام ادا کردہ احرامِ درسِ اسرار مدعا
دارد۔ دردِ عدم وداع ہمدگر اگر صد عمر در گروِ درد و ملالم دارد، روا، اما واللہ کمال گم کردۂ
حواس و سراسر وہم و ہراس آمدہ ام۔ اگر دلِ مولا گلہ آلود گردد، وا دردا! ہرگاہ آدم
عہدِ کردار را سہو کرد و عمر در سرِ لہو کرد، روح را در ہوس مسرور کرد و دل را در حرص کامل، در
معاملۂ دہر کم طالع آمد، و در امرِ معاد کاہل۔ دلِ آگاہ را ادراکِ مصالح کار سہل و مردمِ گمراہ را
اصلاحِ حال محال۔ ملک او لو العزم[۴۷] آگاہ و دم درد آلود گواہ کہ الحال دلِ و داد محل[۴۸]
وداعِ حرص و ہوا کردہ و گردِ ملال مراد را احاطۂ دردِ عمر گاہ در آوردہ۔ واللہ عہد کردم کہ

اگر مَردم، گردِ ہوس کم گردم۔

سالکا، واصلا، مکرّما، مطاعا! الحال کہ محرّرِ دَرِ دلاور الملک را دامگاہِ ورود کردہ، طمع دارد کہ اعلامِ حالِ ساہوکار محرّر کردہ[49] و طرحِ سُود و اصلِ وامِ اُو را در احاطۂ مدِ اطلاع در آوردہ راحلہ رااُو[50] در مرحلہ سر دہد، مگر دلِ والۂ عدو کام در صحرای وا رہد۔ امّا عمِ کامگار در وہم و ہراسِ مکر و حسدِ اعدا و دردِ عدمِ محاصلِ سرکارِ الور و ملالِ درآمد گرما سرگرم و سوگوار و گُم کردہ آرام۔ اُو را مہر گو کہ کس را دل دہد و ہمّ در اصلاحِ حالِ کس گمارد۔ و مرا دلِ آسودۂ رام و طورِ آرام کو کہ سرِ صداع آلودہ در کوہسارِ مالم و دل را در طمعِ امدادِ کار سالہا در ورطۂ طولِ امل دارم۔ حاصل الامر دل در وداعِ گلۂ طالع و سر در کلاہِ احاطۂ کرمِ کردگار در آوردہ، احرامِ صحرا دارم کہ گرد گردا و صرصروار آوارۂ عالم گردم۔ اگر طالعِ مسعود کہ لوحِ طلسمِ مرادِ دارد، مدد کرد، و عروسِ مدّعا سر در دامِ ارادۂ دعاگو در آورد، ہو المراد والّا لامحالہ[51] در گامِ اول رہروِ راہِ عدم و در سلسلۂ اہلِ کارِ عارِ دُودۂ آدم۔ الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

صرصرِ صدمِ سرد آمد دل	ہمہ درد و ہمہ گرد آمد دل
گہ درم دامِ دلِ ما گردد	گہ کرم کامِ دلِ ما گردد
ہوسِ طرّہ طرّار اُو را	حرصِ وصل و سرِ دلدار اُو را
سادہ دل گردِ ہوسہا گردد	کہ عسل دامِ مگسہا گردد

معاملۂ سوداگرِ ولد الحرام دلِ گرم مہرِ سراسر کرمِ مولا را در مادّۂ اسد کمِ طالع سرد کردہ و کلامِ ہمدم صمصامِ حسدِ اعلام سراسر آلام۔ اُو گرہِ ملال در دلِ وداد اساسِ والا در آوردہ۔ مأمول کہ گردِ ملال ہوا گردد و گرہِ دل وا گردد۔ ملک الودود طولِ عمر و دوامِ مال، کمالِ اسلام[52] و صلاحِ حال عطا دارد۔

والسّلام والاکرام

قصه مختصر، چون سر رشتهٔ هر کار بزمانی باز بسته است، در آن کشاکش از بند نتوانستم بدر جست۔ بیخودی گریبانم گرفت و بازم به دہلی آورد۔ روزگاری دراز بخاک نشینی سپری شد و چرخِ گردنده بسی برگردِ این تیره خاکدان بگشت که غنودگیهای مرا بامداد رسید و مرغِ سحرخوان شوقِ نو بر آورد۔ پس از ان که اسباب پریشانی دست بهم داد و تماشِ آوارگی را تار و پود پدید آمد، شوقِ سلسله خا زنجیرِ خودداری گسیخت و پریشانی زورق بطوفانِ روانی افگند۔ پای خوابیده برفتار آمد و سرِ آرمیده بگردش، اشتلمِ شوق گلبانگ برقدم زد وسعیِ نفس دامن بکمر۔

ہرچند مرا بایستی به کلکته رسید و چارهٔ لب تشنگیِ خویش از محیط جست، امّا از آنجا که عنانِ جنبشِ ذراتِ کائنات بکفِ اضطرار سپرده اند و رہروانِ مراحلِ توہمِ وجود تا خود را بتحیّر نستایند، راه بجائی نبرده، نخست اتفاقِ ورود به لکھنو افتاد۔ نظم

اندر آن بقعهٔ معمور ز دلتنگیِ خویش	حسرت آگین چو گنهگار بزندان رفتم
جلوه در طالعِ خاشاکِ من افتاد زبون	شد غلط جادهٔ گلخن، بگلستان رفتم
تشنهٔ بحرِ تماشا شدنم صرفه نکرد	که ز جوشِ عرقِ شرم بطوفان رفتم
سبزهٔ رنگِ طراوت بخزان باخته‌ام	خس شدم، تا بچراگاهِ غزالان رفتم
کاش میسوختم و دادِ فنا میدادم	شرم بادا که بدان تازه خیابان رفتم

مہربانان گرد آمدند و بزرگان انجمن شدند و رفته رفته ذکرِ خاکساریهای مرا به بزمِ آغا میر نامی از ساداتِ عامّهٔ آن دیار که در آن روزها به آہنگِ معتمد الدولگی بلند آوازه بود و به ترخانیِ فرمانروای آن کشور و مدار المہامیِ آن سلطنت اشتہار داشت، رسانیدند، تا از آن جانب ایمای کششی رفت۔ ازین سوُ نیز آشوبِ ہوسی گل کرد۔ چون ملازمت قرار یافت، خواستم، دستمایهٔ عقیدتی سرانجام دادن۔ و ره آوردِ عالمِ عبودیتی عرضه داشتن۔ طبع از فکرِ قصیده شگفتگی کرد، و سینه برین آرزو تنگی۔ جنونِ شوقم به بیدای

کنارِ ناپیدای نثر انداخت و سوادِ عبارتی ہم در صنعتِ تعطیل روشن ساخت۔ اگرچہ وقت اقتضای دیدنِ آن جا ہمند نکرد و آن ہوس از سینہ بدر رفت، امّا آن مسودّہ در سفینہ ماند۔

وہوہذا

مطرحِ مراحمِ ملک الودود[59]، کامگارِ طالعِ مسعود، مطلعِ مہرِ عطا و کرم، سلالۂ دودۂ آدم، دام عطاوہٗ و مدّ علاوہٗ ط

دعاگو، اسد اللہ مراسمِ مدح ادا کردہ و سرِ کلاوۂ دردِ دل وا کردہ در ساحلِ اطلاعِ حال طمعِ حصولِ گوہرِ آمال دارد۔ درد و الم روحِ مراسحر آسا سراسر در دامِ دمِ سرد در آوردہ و صعودِ دودِ سودا دلِ والہ را دمِ طاؤس کردہ، دلِ کم حوصلہ عالم عالم درد[60] و الم را اصلا در دادہ، وہم و ہراس دلِ آوارہ را در صحرا صحرا گردِ ملال سر دادہ؛ سامعہ مردودِ اصطکاکِ در درآمدِ کارہا و لامسہ محرومِ مسِ ساعدِ مساعدِ مدّعا، در عالمِ رسم و راہ رحم و کرم معدوم۔ ہم دعاگو را سوالِ در ہا عار و ہم حالِ ہمہ اہلِ دہر معلوم، کہ ہر کس در ہوسِ دوا ہر سوگہ دود[61]، سرِ صداع آلودہ در کوہ مالد، مگر در سرکارِ اودھ[62] معمارِ عدل و داد سراسر دہر را گلکدۂ ارم کردہ و امطارِ عطا و کرم سرِ احرارِ عالم را در دامِ حصولِ مدّعا آوردہ۔ ارادہ کردم در درگاہِ دار السّلام آسا رسم و عطرِ گلِ مراد در حلۂ ہوس مالم۔ حاصل الامر المِ سہامِ ہوس در دل دود و اوہامِ سودا در سر۔ آلامِ راہِ دور گوارا کردم و راحلہ را در مرحلہ رہگرا۔ للہ الحمد کہ طالعِ رسا مدد کرد و ہمِ دو صد کردہ را سر کردہ در اودھ، آلِ محمّد را دار السّرور، ورود کردم[63]۔ گو کہ در عرصۂ عصر در گروہِ اہلِ کمال گردِ کردارم، امّا مدّاحِ سرکارِ عالم مدارم و عالم عالم گوہرِ مدح در سلکِ سطور دارم۔ دلِ سداد محملِ طرحِ اساس و داد کردہ و کلکِ عطارد کردار دہ مصرعِ سادہ در احاطۂ دامِ مسطر در آوردہ مصارع[64]۔

اکرمِ اہلِ کرم اسعدِ اولادِ رسول ۔۔۔ داورِ دادرس و سرورِ عالم آرا

دَرِ اُو مصدرِ عدل و کرم و سُور و سرور | دلِ اُو مطلعِ علم و عمل و رحم و عطا
گر دُوَد گردِ ہمِ ادہمِ اُو در عالم | ہر مسِ دہر طلا گردد و ہر صعوہ ہما
عدل را راہِ درِ درگہِ اُو کردہ طلوع | مُلک را گردِ رہِ عسکرِ اُو دادہ نوا
درِ اُو آمدہ درگاہِ ملوکِ عالم | کہ گدا آمدہ کاؤس و دعاگو دارا

داورِ دادگرا، روحم در سلاسلِ آلام در آمدہ و کاردہا رُو در دل کردہ، دلِ دردمحرمِ دوا محرومِ طمعِ مرہم دارد کہ گرہ کشادِ حالِ مرادرہم دارد۔ مامول کہ سرکارِ والا سحرِ حلال و گوہرِ کمالِ مرا درسلکِ مطالعہ در آوردہ اصلاحِ حال صلہ دہد، مگر دلِ گرہ درگرہ دامِ مدعا گردد کہ ہُما ہمطالعِ ماہ و مگس ہمسرِ ہما گردد۔ احکم الحکام وصمد العلام سروِ سرکردۂ اہلِ کرم عمدۂ امرائدار المہامِ والاہمم را عمرِ دوام اساس و امرِ عالم مطاع و حکمِ عدو مال و دلِ آسودہ و طالعِ مسعود عطا دارد ط

محرر اسداللہ۔ محررہٗ دومِ محرم الحرام،

حواشی

از

مرتب

۱۔ دیباچہ

[دیباچے سے متعلق ان حواشی میں ل سے نسخۂ لاہور بخطِ غالب مراد ہے؛ ک سے کلیاتِ نثرِ فارسی؛ اور م سے میرا ذاتی نسخہ۔ یہاں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے سامنے مطبوعہ کلیاتِ نثر کی بجائے خطی نسخہ رہا ہے، جس کی بنا پر یہ ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ غالب کا دیکھا ہوا ہے]

۱ اصلی مسودے میں نہیں، مطبوعہ کلیاتِ نثر میں یہی عنوان ہے۔

۲ یہ عنوان صرف م میں ہے؛ ل اور ک میں موجود نہیں ہے۔

۳ ل، ک: دیماہ

۴ ل، ک: یاسم

۵ م: مہمل (ل، ک سے درستی کی گئی) یہ م کے کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے

۶ ل، ک دونوں جگہ ساقط

۷ ل میں اس سے پہلے واوِ عاطفہ ملتی ہے۔

۸ ل: بیش ازیں نقل؛ ک کا متن م کے مطابق ہے۔

۹ اس کے بعد اب ک میں یہ اضافی عبارت ملتی ہے:

ای فرقِ اعتبارِ سلمان پارسی را بخبشِ زبانِ گہر فشانِ گرامی و خشور نازی بافسرِ منّا برافراختہ و شہر بانو دُختِ یزدجُردِ عجمی را ہمخوابۂ خامسِ آلِ عبا ساختہ؛ چوں جوہرِ اصلِ وجودم نیز از خاکِ پارس سرشتۂ در رُوی ہموطنانم از بید ستگاہی خجلِ منشان و از تمغای مُہرِ رسول داغش رشحۂ طرازِ نجاتِ بگریبانِ توقیع نہادم افشان (آفرینندۂ آفرین)

ل کا متن م کے مطابق ہے۔

۱۰ ل: ست۔ م میں سرے سے نہ یہ ہے، نہ وہ۔

۱۱ ل: خدائی ست۔ یہی ک میں بھی ہے۔

۱۲ ک میں اس سے قبل لفظ 'لاجرم' ملتا ہے۔

۱۳ ل، ک میں 'آیینہ داران' سے قبل الفاظ 'ہر آیینہ' کا اضافہ ہے۔

۱۴ ل: ست

۱۵ یہ شعر ک سے غائب ہے۔ ل کا متن البتہ م کے مطابق ہے۔

۱۶ م: بندہ (سہوِ کتابت۔ ک سے درستی کی گئی)

۱۷ ل: محمد اسداللہ خان؛ ک: اسداللہ خان

۱۸ ل: منشار

۱۹ ل اور ک دونوں جگہ الفاظ کی ترتیب یوں ہے: سمرقندی نشار، اکبرآباد[ی] مولد، دہلی مسکن اسداللہ خان المتخلص بہ غالب پس از نوردیدنِ بساطِ دعوی..... الخ

۲۰ ل: نشاندہ ام

۲۱ ل: خرامندگانِ فضاہای ایں بہارستان؛ ک: ..... فضای....

۲۲ ک: از شیشہ ریزۂ بزمِ باستانی میکشانش

۲۳ ل، ک: پیرہن است۔ نیز دونوں جگہ اس کے بعد یہ ہے: فرد

ہرزہ مشتاب و پیِ جادہ شناسان بردار
ایکہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

۲۴ ل، ک میں یہ لفظ (گویا) نہیں ہے۔

۲۵ ک میں اس کے بعد یہ الفاظ ہیں: دماغم آتشکدۂ راز است و دلم سرچشمۂ گداز (برگوشۂ سماط)

۲۶ ل، ک: جادو بیانان (م میں صرف جادو بیانم ہے۔ لیکن یہ محل جادو بیانانم کا ہے۔ لہذا اصلاحِ قیاسی کی گئی)

۲۷ ل: دانبازِ آنانم

۲۸ ل، ک : گوہر

۲۹ ک میں اس کے بعد یہ شعر ہے :

نگویم، تازہ دارم شیوۂ جادو بیانان را
دلی در خویش بینم کارگر جادوی آنان را

۳۰ رسائی سعی . . . . . بہندوستان آوردہ ــــ یہ عبارت ک میں نہیں ملتی۔

۳۱ ل میں اس سے پہلے الفاظ 'استغفراللہ' بھی ملتے ہیں۔

۳۲ ل : گزافست

۳۳ ل میں اس سے قبل لفظ 'آرے' بھی ہے

۳۴ ل : گردن است

۳۵ ل : ستاند

۳۶ لفظ خلق ل میں نہیں ملتا۔

۳۷ 'میتوان گفت' سے لے کر یہاں تک کی عبارت ک میں نہیں ملتی۔

۳۸ ل : آلاست

۳۹ لفظ است ل اور ک میں نہیں ہے

۴۰ 'ستم کشیدہ' ک سے ساقط ہے۔

۴۱ ل : و آگفت رسیدہ دلی۔ ک مطابق م

۴۲ 'حسنِ گلوسوز' کے الفاظ ک میں نہیں ملتے۔

۴۳ ل : آب است

۴۴ ل : بود

۴۵ ک میں یہ مصرع نہیں ہے۔

۴۶ ل، ک : طرفِ انجمن

۴۷ ک : خوشدلی

۴۸ ک : نالہ بر خرمن

۴۹ لفظ چنیں ک میں نہیں ہے

۵۰ ک : نوائی

۵۱ ل، ک : موجِ مے

۵۲ ک : خجلت

۵۳ ل، ک : بر پشتِ پا

۵۴ ل : تن است

۵۵ ل، ک : بمشاہدہ

۵۶ ل : بیداری

۵۷ ل : بہ

۵۸ ک میں اس کے بعد پہلے یہ عبارت ہے اور پھر اس کے بعد شعر: چنانکہ مقطعِ غزل سازِ نوای این تظلم است و شکایت در تضرع محو و فضولی در ارادت گم۔ فرد

۵۹ ل، ک، نیز دیوانِ فارسی (طبع دوم ۱۸۶۳ء) میں یہ مصرع یوں ملتا ہے:

ورنہ غالب نیست آہنگِ غزلخوانی مرا

اس کے برعکس دیوانِ فارسی طبع اول (۱۸۴۵ء) اور پنج آہنگ کی دونوں اشاعتوں (۱۸۴۹ء و ۱۸۵۳ء) میں مصرع متن کے مطابق ہے۔

۶۰ ل : صیدِ زبون

۶۱ 'ہر چند' سے لے کر یہاں تک کی عبارت ک میں نہیں ہے، اور اس کی جگہ 'سعیم' سے پہلے صرف ایک لفظ 'باآنکہ' ملتا ہے۔

۶۲ ل : کلکم از عجزِ تحریر (در کسوت)۔ ک میں م کے مطابق ہے۔

۶۳ لفظ اما ل اور ک میں نہیں ہے۔

۶۴ ک : فسردہ

۶۵ ک : تا

۶۶ 'نظارگیانِ یکرنگ' کے الفاظ ک میں نہیں ملتے۔

۶۷ ل : مباد

۶۸ ک میں یہ عبارت 'بر دل' تا 'ک' موجود نہیں ہے۔

۶۹ ل : سلک (ممکن ہے، سہوِ کاتب ہو) ک مطابق م

۷۰ ل : ہم

۷۱ یہ 'آمد' ل اور ک میں نہیں ہے۔

۷۲ 'کہ مباد' سے 'افتد' تک کی عبارت ک میں ساقط ہے۔

۷۳ لفظ 'رو' ل اور ک میں نہیں ملتا۔

۷۴ عاطفہ ل اور ک سے ساقط ہے۔

۷۵ ل : دو مین دَر؛ ک : دو یمین دَر

۷۶ ک : صحیفہ

۷۷ ل میں نہیں ہے۔

۷۸ اضافہ از ل ، ک

۷۹ ک : بانی

۸۰ ک میں کوئی تاریخ موجود نہیں ہے
م میں سال نامکمل ہے۔ البتہ ل میں تاریخ 'غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری' ملتی ہے۔

۲ ـ انتخاب اردو

[متن کے حاشیے میں شعروں کی تعداد کے مطابق نمبر دیے گئے ہیں۔ یہاں
حواشی کے شروع میں نمبر سے شعر مراد ہے

غ : وہ نسخۂ دیوان جو غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور دو جگہ یعنی پہلے
رامپور سے اور پھر لاہور سے شائع ہوا ہے۔

ح : نسخۂ حمیدیہ

ش : نسخۂ شیرانی

ل : گلِ رعنا کا نسخۂ مطبوعۂ لاہور

م : گلِ رعنا نسخۂ مالک رام

ن : دیوان کا مطبوعہ نسخہ، مطبع نظامی، کانپور (۱۸۶۲ء)]

---

۲ یہ شعر غ میں نہیں ہے؛ ح اور ش میں ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو کہا گیا تھا۔

۴ اس زمین میں کوئی غزل غ میں نہیں ملتی، یہ پہلی مرتبہ ح میں آئی ہے۔

۵ ل، ح : لیتا ہوں۔

۶ ل : ڈھانکا؛ ش : ڈھانپے۔

۷ یہ غزل غ میں نہیں ہے، لیکن ح کے حاشیہ پر ملتی ہے؛ اور ش کے متن میں۔
ل میں 'بھرنے' ملتا ہے؛ لیکن ح اور ش میں م کی طرح 'بھرتے' ہی ہے اور یہی درست ہے

۹۔۱۰ ش میں ان دونوں شعروں کے وسط میں لفظ 'قطعہ' لکھا ملتا ہے؛ یہی ل میں بھی ہے۔

۱۱۔۱۲ اس زمین میں غزل تو غ میں ہے، لیکن یہ شعر اس میں نہیں ملتے۔ ل میں یہ دونوں شعر غزل (۵) کے

چاروں شعروں کے بعد لکھے ملتے ہیں۔

۱۱ ل ، ح ، ش سب جگہ مصرعِ اولیٰ میں 'دکھاؤں' ہی ملتا ہے۔ سب سے پہلے اسے دیوان کی طبعِ اول (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں تبدیل کرکے 'دکھاتا' بنایا گیا تھا؛ متداول دیوان میں بھی 'دکھاتا' ہی ہے۔

م میں مصرعِ ثانی کا آخری ٹکڑا 'کار فرما جل گیا' نہیں لکھا گیا، اس جگہ بیاض چھوڑ دی گئی ہے۔

۱۳ غ میں یہ غزل نہیں ملتی۔ ل میں مصرعِ اولیٰ م کے مطابق ہے، لیکن متنِ ح میں اولاً مصرع کی شکل یہ تھی: عشرتِ ایجاد، چہ بوے گل دکو دودِ چراغ۔ اور بعد کو اسے متداول مصرعے میں تبدیل کر دیا؛ ش میں بھی اصلاحی شکل ہے۔

م میں مصرعِ ثانی میں 'تیری' ملتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ 'وہ' ہے، حال آنکہ اور سب جگہ (بشمولِ ل) اس کی جگہ 'سو' ملتا ہے۔

۱۴ یہ شعر ح ، ش میں موجود ہے، لیکن آخری انتخاب میں نہیں آیا تھا؛ لہذا متداول دیوان میں شامل نہیں ہے۔

۱۵ ل ، متنِ ح ، ش تینوں جگہ م کے مطابق ہے، لیکن ح میں اس کا بدل: تھی نو آموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند بھی درج ہے، جو متداول متن ہے۔ نیز ہر جگہ مصرعے کا آغاز لفظ 'تھی' سے ہوا ہے؛ اس کے برخلاف طبعِ نظامی (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء) میں اس جگہ 'ہے' چھپا ہے۔

۱۶ مصرعِ ثانی میں ہر جگہ (ل ، ح ، ش ، ن) 'وہ' کی جگہ 'سو' ملتا ہے۔

۱۷ غزل (۹) غ میں نہیں ملتی؛ ح کے بھی متن میں نہیں تھی، بلکہ حاشیے میں لکھی ملتی ہے؛ البتہ ش کے متن میں ہے۔

ل : نہ جوابِ نبرد تھا۔ اور سب جگہ م کے مطابق ہے۔

۱۸ مصرعِ ثانی میں م میں 'میرا' لکھا ہے۔

۱۹ م کے سوا اور ہر جگہ: دل کا درد ۔

۲۲ یہ غزل غ اور ح میں نہیں ملتی۔ ل بھی نہیں سکتی تھی؛ ش تک کے متن میں بھی نہیں، بلکہ حاشیے میں درج ہے اور اس کے شروع میں لکھا ہے: از باندہ فرستادند۔ گویا یہ سفرِ کلکتہ

(۱۸۲۷ء) کے دوران میں وجود میں آئی تھی۔

م میں پہلے مصرعے کی جگہ بیاض ہے؛ یہاں مصرع ش کے مطابق ہے، جہاں یہ غزل سب سے پہلے نقل ہوئی۔ اب یہی متداول ہے۔

دوسرا مصرع اسی طرح ہے، جیسا ش میں۔ ل: اک

۲۳ مصرعِ ثانی، ش، ل: یک۔ طبع نظامی میں بھی 'یک' ہی ہے۔

۲۶ مصرعِ ثانی، ہر جگہ 'سوتے'۔ م میں سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے۔

۲۷ مقطع کے بعد ل میں مندرجۂ ذیل پانچ شعر بھی نقل ہوئے ہیں:

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا	دکھاؤنگا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا	کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا	مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
مدار اب گھاس کے ہے کھودنے پر میرے درباں کا	اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا	خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں

۲۸ یہ غزل غ میں نہیں ہے، البتہ ح اور ش دونوں جگہ ملتی ہے۔

۲۹ مصرعِ اولیٰ میں ہر جگہ 'کرنے میں' ہے اور یہی متن درست ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں 'کرنے پہ' کاتب (یا مرتب) کا تصرف ہے۔

۳۰ م میں 'گذرگاہ' ہی ملتا ہے، لیکن غالب کے اسلوب کے مطابق اسے 'ز' سے بنا دیا گیا ہے۔

۳۱ مصرعِ اولیٰ کی پہلی شکل ح کے مطابق یوں تھی: مرگیا صدمۂ آواز سے قُم کی، غالب؛ اور یہی ش میں ہے۔ م (اور ل بھی) کی شکل بعد کی ہے۔

۳۲ یہ غزل غ میں موجود ہے اور ح و ش میں بھی۔ چونکہ بعد کو اس غزل کا کوئی شعر انتخاب میں نہیں لیا گیا، اس لیے یہ متداول دیوان سے یکسر خارج ہے۔

ح: با وصفِ شہرت۔ غ: جوں شررِ در سنگ

۳۳ مصرعِ اولیٰ غ، ح، ش: پیدا ہے۔

مصرعِ ثانی غ، ش: دیویگا؛ ح: لایا ہے۔ ل: آرزو سے (یہ سہوِ کتابت ہے)، صحیح:

آرزو سے)

۳۵ ح : بد دماغی ۔ م میں مصرعِ ثانی میں ردیف 'اپنا' لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سہوِ کاتب ہے۔

۳۶ یہ غزل غ میں نہیں ہے اور ح کے بھی حاشیے پر درج ہے؛ ش کے متن میں ہے۔
مصرعِ ثانی ۔ ش ، ن : پردا

۳۷ مصرعِ اولیٰ ۔ ح ، ش ، ل ، ن : نظر ہائے۔ مصرع ثانی میں ہر جگہ : دکھ (بدونِ واو)

۴۰ یہ غ میں ہے۔ ح میں اس زمین میں دو غزلیں ہیں۔ دونوں کے بعض اشعار لے کر (اور بقیہ کو ترک کر کے) ایک غزل بنائی گئی، جواب متداول دیوان میں ملتی ہے۔

۴۱ مصرعِ اولیٰ ۔ غ ، ح ، ش : تپش ۔ زہرۂ دل ؛ ن : شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
مصرعِ ثانی ۔ سب جگہ : ہر یک

۴۲ ل ، ن : واں ، یاں

۴۳ م میں مصرعِ اولیٰ کی جگہ بیاض ہے۔ یہاں متن غ کے مطابق ہے، جو قدیم ترین روایت ہے۔
ح میں مصرعِ ثانی میں 'ہجومِ اشک میں' کی جگہ 'سے' چھپا ہے، بظاہر یہ سہوِ کاتب ہے۔

۴۴ ل ، ن : واں ، یاں ۔ م میں مصرعِ اول میں 'چراغ' ہے، جو ظاہراً سہوِ کاتب ہے۔ اور سب جگہ چراغاں ہے اور یہی یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

۴۵ یہ شعر غ اور ح میں نہیں ملتا؛ البتہ ش میں موجود ہے۔
ل ، ن : یاں ، واں

۴۶ یہ شعر بھی غ اور ح میں نہیں ہے؛ ش میں ملتا ہے۔
ل ، ن : یاں ، واں

۴۷ ل ، ن : یاں ، واں ۔ یہ شعر بھی غ اور ح میں نہیں ہے؛ ش میں ہے۔

۴۸ مصرعِ اولیٰ غ : جوشِ یادِ نغمۂ دمسازِ مطرب سے (اسد!)
یہ شعر ن میں نہیں ملتا

۴۹ یہ غزل غ میں نہیں ملتی؛ ح اور ش میں موجود ہے۔

۵۲ اس زمین میں غزلیں غ اور ح اور ش ۔ سب جگہ ملتی ہیں۔ لیکن صرف پہلا شعر ان میں ہی،

دوسرا شعر صرف م میں ہے۔ متداول دیوان کے لیے ان غزلوں سے کوئی شعر انتخاب نہیں ہوا تھا۔

۵۴ یہ غزل غ اور ح اور ش میں ہے۔ لیکن م کے صرف پہلے دو شعر وہاں ہیں، تیسرا شعر ہر جگہ سے غائب ہے۔ متداول دیوان میں ایک بھی نہیں ہے۔

مصرعِ ثانی۔ ل : تری

۵۵ ل : یاں

۵۷ یہ غزل غ اور ح اور ش میں نہیں ملتی۔ م میں یہ تقریباً مکمل ہے؛ ن میں صرف یہ دو شعر زاید ہیں :

نوازشہاے بیجا دیکھتا ہوں ۔۔۔ شکایتہاے رنگیں کا گلا کیا!

سن اے غارتگرِ جنسِ وفا! سن ۔۔۔ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

۶۱ ن : عطرِ پیراہن

۶۵ م میں مصرعِ اول میں 'دعوہ' لکھا ہے، جو سہوِ کاتب ہو سکتا ہے۔

۶۸ یہ غزل غ میں نہیں ہے، لیکن ح اور ش میں ہے۔

مصرعِ اول۔ ل : یاں

۶۹ مصرعِ ثانی۔ ن : اوس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا

۷۱ غ اور ح اور ش ـ تینوں جگہ اس زمین میں دو دو غزلیں ہیں، لیکن یہ شعر ان میں سے کسی میں بھی نہیں ہے؛ ن میں ہے۔

۷۲ یہ غزل غ اور ح میں موجود ہے۔ ش میں بھی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن چونکہ اس خطی نسخے سے ردیف الف کے کچھ ورق ساقط ہو گئے ہیں، اس لیے یہ غزل وہاں نہیں ملی۔

مصرعِ اوّل۔ اولاً یہ مصرع یوں تھا : لے تو لوں، سوتے میں، اس کے بوسہ ہاے پا، مگر

۷۵، ۷۶ مصرعِ ثانی۔ ن : واں

۷۷ ح میں موجود ہے۔ ش کے ناقص ہونے کے باعث یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس میں تھی یا نہیں؛ موجودہ نسخے میں نہیں ملتی۔

مصرعِ اول۔ ح : تکلیفِ سیرِ گل مت دو؛ ن : تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو۔

۷۸ مطبوعہ ح میں 'محرمِ عشق' چھپا ہے (ص ۱۵) یہ بیجا تصرف ہے، اور غلط بھی۔

۷۹ یہ غزل غ اور ح دونوں جگہ ہے لیکن ان میں یہ شعر نہیں ملتا۔ ش میں موجود ہے۔

۸۰ یہ غزل غ میں تو نہیں، البتہ ح اور ش میں ملتی ہے۔

۸۴ یہ غزل ح اور ش میں ہے۔

۸۵ ش : تیرا

۸۶ ش : تیرے

۸۷ ش : تھا میں صحرا میں کہ گھر یاد آیا

۸۸ یہ غزل ح اور ش میں موجود ہے۔

۹۳ اس زمین میں ایک غزل غ میں ہے، لیکن اس میں یہ دونوں شعر نہیں ملتے۔ ح اور ش میں بھی ہے، اور وہاں یہ شعر بھی ہیں۔

مصرعِ اولیٰ۔ ن : کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں!

۹۵ یہ غزل غ اور ح اور ش ـــ سب جگہ ملتی ہے۔

۹۶ مصرعِ ثانی۔ ن : ہوں شمعِ کشتہ

۹۸ مصرعِ ثانی۔ ش : تیرے خیال

۹۹ مصرعِ ثانی۔ ش : اب لائقِ توجہِ قاتل نہیں رہا

۱۰۰ مصرعِ اولیٰ۔ ن : واں

۱۰۱ مصرعِ اولیٰ۔ غ، ح، ش : ہوں قطرہ زن بوادیِ حسرت شبانہ روز

۱۰۲ غ میں پہلے مقطع یوں تھا:

اندازِ ربط یاد ہیں سب مجکو (اے اسد!) درد آ کر، اختلاط کے قابل نہیں رہا

اسے قلمزد کر کے شعر یوں بنایا:

اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجکو، پر اسدؔ جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

یہی روایت ح میں ملتی ہے۔ لیکن ش تک پہنچتے پہنچتے پہلا مصرع یوں ہوگیا:

• بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا ہوں، پر اسدؔ!

یہی م میں ہے. اب متداول صورت (ن) ہے : بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسد!

۱۰۳ غزل غ اور ح میں ہے لیکن غ میں تو یہ دونوں شعر ہیں ہی نہیں، اور ح میں بھی حاشیے میں اضافہ ہے. البتہ یہ ش کے متن میں ہیں.

۱۰۵ یہ غزل ح اور ش ملتی ہے.

۱۰۷ ن : تراز

۱۰۸ ل ، ن : اک آفت

۱۰۹ یہ غزل ح اور ش میں ہے.

۱۱۳ مصرعِ اولیٰ : ل ، ن : تری

۱۱۴ یہ غزل ح کے حاشیے اور ش کے متن میں ملتی ہے.

۱۲۰ مصرعِ اولیٰ . ن : ہنگامۂ ہستی

مصرعِ ثانی . ح : ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

۱۲۱ یہ غزل غ اور حاشیۂ ح اور ش میں ملتی ہے.

۱۲۲ مصرعِ اولیٰ . ن : نشانی تیری

۱۲۳ مصرعِ اولیٰ . ح : باقی . تو عجب کیا

مصرعِ ثانی . ش : تڑپھی

۱۲۴ مصرعِ اولیٰ . ن : دیدان (اور یہی صحیح ہے)

۱۲۵ مصرعِ ثانی . غ ، ش : میرے

۱۲۶ غ اور ح اور ش ، تینوں جگہ اس زمین میں غزل ملتی ہے. اس زمین میں کوئی شعر متداول دیوان میں نہیں ملتا.

۱۲۷ یہ غزل غ اور ح اور ش ، ہر جگہ ملتی ہے.

۱۲۸ مصرعِ اولیٰ . ح : انتظار (سہوِ کتابت)

ح میں مصرعِ ثانی پہلے یوں تھا : سیلابِ گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج

۱۲۹ مصرعِ اولیٰ . ل : افراطِ انتظام (سہوِ کاتب)

مصرعِ ثانی غ اور ح اور ش : کشادہ

۱۳۰ یہ غزل ح اور ش میں ہے۔

۱۳۲ ش : دھنواں

۱۳۳ ح ، ن : سیلابِ بلا

۱۳۴ یہ غزل ح اور ش میں ملتی ہے۔
ن میں یہ شعر مطلع نہیں ہے اور اس کا مصرعِ اولیٰ ہے :

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یہاں بھی خانہ آرائی

مصرعِ ثانی میں لفظ 'پھرتی' ، پڑھنے میں 'پھیرے' بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

۱۳۵ مصرعِ ثانی۔ ح ، ن : تری

۱۳۶ متداول دیوان (ن) ، میں مقطع یوں نہیں ہے؛ اور اس کی جگہ یہ شعر ملتا ہے :

نہ لڑ ناصح سے ، غالب! کیا ہوا ، گر اوس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر ، زور چلتا ہے گریباں پر

۱۳۷ یہ غزل غ ، ح ، ش ـ تینوں مجموعوں میں ملتی ہے۔
م میں سہوِ کاتب سے مصرعِ اول کے ابتدائی لفظ الٹ پلٹ ہوگئے ہیں۔ یوں لکھا ہے : فلک کو ہم سے۔ اور ہر جگہ ٹھیک 'فلک سے ہم کو' ملتا ہے ، لہٰذا درستی کردی گئی۔

۱۳۸ غ میں پہلے شعر کی شکل یہ تھی :

میں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ باندھے ہے
شعاعِ مہر سے جرمِ نظارہ چشمِ روزن پر

بعد کو دوسرے مصرع میں اصلاح کرکے اسے یوں بنادیا : شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
ح اور ش میں یہ م کے مطابق ہے ، الّا یہ کہ مصرعِ اولیٰ میں 'ہم' کی جگہ 'میں' ہے۔ ن اور م یکساں ہیں۔

۱۳۹ مصرعِ اولیٰ ش ، ل ، ن : کر (سہوِ کتابت)

[اس کے بعد ل میں ۹ شعر مندرجۂ ذیل غزل کے ملتے ہیں :

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر]

۱۴۰ اس زمین میں غ ، ح ، ش میں غزلیں ملتی ہیں۔

۱۴۲ یہ غزل غ میں نہیں ملتی؛ ح اور ش میں ہے۔
مصرعِ ثانی میں سب جگہ بشمولِ ل: میں ہوں (م میں سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے)

۱۴۴ ش : خمِ گیسو
م میں مصرعِ ثانی میں دور و رراز لکھا ہے، یہی ح میں ہے؛ یہ سہوِ کاتب ہے۔ ٹھیک دور دراز (بدونِ عاطفہ) ہے جیساکہ ش اور ن میں ہے۔ لہذا متن میں درستی کر دی گئی ہے۔
ل : کارِ دراز

۱۴۵ یہ غزل ح اور ش میں ہے۔
سب جگہ: مند (بدون ہاے ہوز)، نیز ح اور ن میں 'اک بار' کی جگہ 'ہے ہے!' ہے؛ ش مطابق م کے ہے۔

۱۴۶ مصرعِ ثانی۔ ش : میرے

۱۵۰ یہ غزل غ ، ح ، ش، سب جگہ ہے۔

۱۵۱ مصرعِ ثانی۔ غ : نکالے ہے زپاے شمع برجا ماندہ خارِ آتش۔ ح میں بھی پہلے یہی مصرع لکھا تھا، بعد کو اسے م کے اس مصرع کے مطابق بنا دیا گیا۔

۱۵۲ یہ غزل غ اور ح اور ش میں ملتی ہے۔

۱۵۴ مصرعِ اولیٰ۔ ح : حسرتِ پرواز (سہوِ کاتب)
مصرعِ ثانی۔ ل ، ح ، ن : ترے

۱۵۵ یہ غزل بھی غ اور ح اور ش سب جگہ موجود ہے۔ اس زمین میں (بلکہ ردیف غین ہی میں) ن میں کوئی شعر نہیں ملتا۔

۱۵۷ یہ غزل بھی غ اور ح اور ش میں ملتی ہے۔

۱۵۸ مصرعِ اولیٰ۔ ح ، ش ، ل : تھی

غ میں مصرعِ ثانی یوں لکھا ہے: گھر پر پڑا غیر کے: کوئی شرار حیف! یہ سہوِ کاتب ہے، جو خود مصنّف ہے۔

۱۶۰ ش: ایک بار

۱۶۱ یہ غزل ح اور ش میں ہے۔

مصرعِ اولیٰ۔ م میں ذوقِ وجد تھا؛ اور دونوں جگہ 'وجدِ ذوق' ملتا ہے، اور یہی درست ہے۔ اس لیے متن میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ ہاں ح میں 'وجہِ ذوق' ہے، جو سہوِ کاتب ہے۔

ن میں اس شعر کے مصرعِ اوّل کو یوں بدل کر مقطع بنا دیا ہے:

یاد ہیں 'غالب'! تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں

ح میں 'مطبوعہ' عنوان دے کر یہی مصرع 'فرطِ ذوق' سے لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی سہوِ کاتب ہے۔

۱۶۳ مصرعِ اولیٰ۔ ل، ح، ن: مرے

۱۶۴ ح اور ش دونوں جگہ یہ غزل ملتی ہے۔

مصرعِ اولیٰ، ن: گام (سہوِ کاتب)

مصرعِ ثانی، ل: قطرے

۱۶۶ مصرعِ ثانی، ش، ن: ایک

۱۶۷ یہ غزل، غ، ح، ش میں ملتی ہے۔

۱۶۸ مصرعِ ثانی، ن: مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا! نہ مانگ

۱۶۹ یہ غزل ح اور ش میں موجود ہے۔

مصرعِ اولیٰ۔ ح، ش، ن: وفائے گل (ل اور م 'ہوائے گل' پر متفق ہیں)

۱۷۰ مصرعِ اولیٰ۔ ح، ش، ل، ن: کا کہ جو

۱۷۲ اس زمین میں ایک غزل غ میں اور دو دو ح اور ش میں ہیں۔

۱۷۳ اس کی اصلاحی صورت ح میں یوں ہے، اور یہی اب ن کا متن ہے:

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

۱۷۴ ح میں مصرعِ اولیٰ پہلے یہ تھا: شام غم میں سوزِ عشقِ شمع رویاں سے، اسد!

۱۷۵ صرف ش میں ملتی ہے۔ یہ غزل بھی سفرِ کلکتہ کا ثمرہ ہے۔ چنانچہ ش کے حاشیے میں جہاں یہ نقل ہوئی ہے، اس سے پہلے لکھا ہے: از باندہ رسید۔ اسی لیے غ اور ح میں نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ دونوں نسخے اس سے بہت پہلے مرتب ہو چکے تھے۔
مصرعِ ثانی میں م اور ش دونوں جگہ ذرہ (واحد) ملتا ہے، لیکن چونکہ یہ محل جمع کا تھا اور ذرہ کا امالہ بھی اس صورت میں غیر معمولی بات ہوتی، اس لیے بعد کو اسے ذرّے بنا دیا، جیسا اب ن میں ہے۔ لہٰذا میں نے متن میں 'ذرّے' لکھا ہے: یہی ل میں بھی ہے۔

۱۷۶ مصرعِ ثانی۔ ش: میرے (اس غزل کو مرتبِ نسخۂ حمیدیہ نے اس حصہ میں درج کیا ہے، جس کا ہمطرحی کلام قلمی نسخے میں نہیں تھا۔ یہاں اس شعر کے مصرعِ اوّل میں 'نمود' کی جگہ 'نمو' چھپا ہے۔ یہ ظاہراً سہوِ کاتب ہے)

۱۷۷ مصرعِ اولیٰ۔ ش: میری

۱۷۸ یہ غزل غ (حاشیہ)، ح (حاشیہ)، ش میں موجود ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت قدیم ہے۔ پورا متن غ کے مطابق ہے۔

۱۸۰ مصرعِ اولیٰ۔ ح: تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے

۱۸۱ مصرعِ اوّلی۔ ح، ل، ن: قویٰ

۱۸۲ یہ غزل بھی تینوں مجموعوں میں ملتی ہے۔
مصرعِ ثانی۔ ل، ن: اک

۱۸۳ مصرعِ اولیٰ۔ ل، ن: مرے

۱۸۴ یہاں م میں مصرعِ ثانی میں سہوِ کاتب سے 'تو ایک اور' لکھا گیا ہے: درستی کی گئی۔

۱۸۵ مصرعِ اولیٰ۔ غ، ح، ش، ن: کشادہ (صرف ل میں م کی طرح کشودہ ہے)

۱۸۶ صرف ح اور ش میں ہے

۱۸۸ مصرعِ اولیٰ۔ ح، ل، ن: دھبّا؛ ل: شیوہ نہ تھا؛ ش: شیوا

۱۸۹ یہ غزل غ میں نہیں ملتی، ح اور ش میں موجود ہے۔
مصرعِ ثانی۔ ش: جادۂ غیرِ نگہ دیدۂ تصویر نہیں (سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے)

۱۹۱-۱۹۲ یہ دونوں شعر قطعہ بند تھے، جیسا کہ شعرِ ثانی کے مصرعِ اولیٰ کی ضمیرِ غائب 'وہ' سے ثابت ہے۔
بعد کو جب شعرِ اول خارج کر دینے کا فیصلہ ہوا تو شعرِ ثانی میں مندرجۂ ذیل تبدیلی کر کے اسے مقطع
بنا دیا۔ جیسا کہ ن میں ہے:

غالب! اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں

۱۹۳ یہ غزل صرف ش میں ہے، اس سے پہلے کے دونوں ماخذ اس سے خالی ہیں۔

۱۹۴ مصرعِ اولیٰ۔ ل: تری
مصرعِ ثانی ش، م، ل: خورشید۔ لیکن غالب کے اسلوب کے مطابق یہاں اسے 'خُرشید' بنا دیا گیا ہے۔

۱۹۷ مصرعِ اولیٰ م تک اسی طرح رہا؛ لیکن ن میں اب یوں ملتا ہے:

کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

۱۹۹ یہ غزل غ، ح، ش میں موجود ہے اور ان دونوں شعروں کا متن عین غ کے مطابق ہے۔

۲۰۰ مصرعِ اولیٰ۔ م: دعوۂ (سہوِ کاتب)

۲۰۱ اس زمین میں غ، ح، ش ـــ تینوں جگہ دو دو غزلیں ملتی ہیں۔ م کے اشعار دونوں غزلوں سے لیے گئے ہیں
مصرعِ ثانی۔ غ: مانندِ شانہ، دست بدنداں گزیدہ ہوں؛ ح: جوں شانہ پشتِ دست
بدنداں الخ؛ ش بھی ح کے مطابق ہے؛ م میں مصرعِ ثانی کی جگہ بیاض تھی۔ یہ مصرع جو یہاں
درج کیا گیا ہے، دیوان مرتبہ حسرت موہانی سے لیا گیا ہے؛ یہ انھوں نے اپنے نسخۂ گلِ رعنا سے لیا
تھا۔ ل: مطابق ح و ش

۲۰۴ ح، ل: مرے

۲۰۵ یہ غزل غ اور ح میں نہیں ہے؛ اور ش کے بھی متن میں نہیں، بلکہ اس کے حاشیے پر اضافہ
ہوئی ہے۔ حاشیے کی بیشتر غزلیں سفرِ کلکتہ کے دوران میں کہی گئی تھیں، چنانچہ اس جگہ بھی
'از باندہ رسید' کا عنوان ملتا ہے۔

۲۰۸ مصرعِ ثانی۔ ش، ل، ن: تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں۔ م کے مصرع اور اختلاف
کے علاوہ لفظ کسُو ملتا ہے جو قدما کے یہاں عام طور پر ملتا ہے اور غالب کے زمانے تک بھی رائج
رہا۔ بعد کو غالب نے یہ اصول بنایا کہ اگر قافیے کی ضرورت آ جائے، تو نہ، در نہ 'کسی' افصح ہے۔

۲۱۰ حسبِ معمول مصرعِ ثانی میں یہاں بھی 'دعوہ' ملتا ہے۔

۲۱۱ یہ غزل بھی پہلی مرتبہ ش کے حاشیے میں زیرِ عنوان 'از باندہ رسید' ملتی ہے؛ خود اس کا مقطع اس پر دال ہے کہ 'غربت' میں کہی گئی تھی۔ ن میں صرف اور دو شعر ایسے ہیں جو انتخاب میں نہیں لیے گئے تھے۔

۲۱۳ ش، ل، ن : دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

۲۱۶ ش : تم کو دلتنگیِ زندانِ وطن یاد نہیں

ن : تم کو بیمہریِ یارانِ وطن یاد نہیں ۔ ن میں ش کی بہ نسبت دو شعر زیادہ ہیں۔

۲۱۷ یہ غزل تینوں ماخذ — غ ، ح ، ش — میں ملتی ہے۔

غ میں اولاً یہ شعر یوں تھا:

سخن حیران، تحیر پرفشاں، پرواز بیگانہ　　　پرِ طوطی ہے قفلِ زنگ بستہ آئینہ خانے میں

مصرعِ ثانی میں عروضی سقم تھا۔ اس لیے بعد کو اسے بدل کر اس طرح بنا دیا، جیسے اب م میں ہے۔

۲۱۸ م میں مصرعِ ثانی میں الفاظ 'یوں بھی' ملا کر اس طرح سے لکھے گئے ہیں کہ وہ 'یوہیں' معلوم ہوتا ہے۔

۲۱۹ ح، ش : نہ کر بیباک

۲۲۰ یہ غزل ح اور ش میں ملتی ہے، غ سے ساقط ہے؛ ش، ل : پانو

۲۲۱ ش : ایک

۲۲۷ یہ غزل صرف ش میں ملتی ہے؛ غ اور ح دونوں اس سے خالی ہیں؛ ش : ایک

۲۲۹ مصرعِ اولیٰ۔ ل : اک ؛ مصرعِ ثانی۔ ل، ن : یاں

۲۳۰ م : راز (سہوِ کاتب)

۲۳۵ یہ غزل غ، ح، ش — سب جگہ ملتی ہے۔

۲۳۶ مصرعِ اولیٰ۔ غ، ح، ش : ہوئی تقریبِ منعِ شوقِ دیدن، خانہ ویرانی

ن : ذوق

۲۴۲ یہ غزل غ (حاشیہ)، ح (حاشیہ)، ش میں ملتی ہے۔

م : عشق محبت (سہوِ کاتب) اور سب جگہ (غ، ح، ش، ل، ن) 'نقش' ہی ہے۔

۲۴۳ ح، ل : گل

۲۴۴ ح ،ل،ن: اک

۲۴۵ غ، ش : ہرچند، عمر صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو!

۲۴۶ یہ غزل صرف ش میں ملتی ہے، اور وہ بھی اس کے حاشیے میں۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ سفرِ کلکتہ کے دوران میں قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں کہی گئی تھی۔ اس سفر کا کلام میرزا نے خود صاحبِ ش کو بھیجا تھا، جنھوں نے اسے حاشیے میں لکھوا لیا۔ بعد کو یہ نسخہ خود میرزا نے بھی دیکھا ہے۔

۲۴۸ ل، ن : کوچے

۲۵۲ ل، ن : وعدے

۲۵۳ م : مجھ کو (سہوِ کاتب)

۲۵۴ ل : آباد کرو (م اور ش : آمادہ کرو)

۲۵۵ ش میں اس سے پہلے لفظ 'قطعہ' لکھا ملتا ہے۔

ش : نہیں کھلتا، غالب!

۲۵۶ ن سے یہ شعر ساقط ہے۔

۲۵۷۔۲۵۸ ان دونوں شعروں کی جگہ ش میں صرف یہ شعر ہے:

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید جادۂ راہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اس تلمیح اور واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ذکرِ غالب : ۶۵ بعد

۲۵۹ یہ غزل تینوں بنیادی مآخذ (غ، ح، ش) میں موجود ہے

مصرعِ اولیٰ۔ غ : نازِ بہارِ رفتۂ وصلِ بتاں نہ پوچھ : ح، ش : سامانِ بادشاہی (ش : بادشاہی) وصلِ بتاں نہ پوچھ

۲۶۱ مصرعِ ثانی۔ ح : ستمِ ہمزباں (سہوِ کاتب)، ش اور ن میں متن م کے مطابق ہے۔

۲۶۲ مصرعِ اولیٰ۔ غ، ح، ش : کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل

۲۶۳ یہ غزل غ میں نہیں ملتی؛ البتہ دوسرے دونوں مجموعوں (ح اور ش) میں شامل ہے۔

۲۶۶ صرف ش میں ملتی ہے۔ دوسرے دونوں مجموعوں سے غائب ہے۔

مصرعِ اولیٰ۔ ش، ل : ایک اور؛ ن : اک اور

۲۶۹ مصرعِ ثانی۔ ل، ن : اک

۲۷۰ مصرعِ ثانی۔ ل : خاموشی سے ہی (غالباً سہوِ کاتب ہے)

۲۷۲ مصرعِ اولیٰ۔ ن : چاہیے

۲۷۴ یہ غزل ح اور ش میں ملتی ہے

۲۷۶ مصرعِ ثانی۔ ح، ل، ن : مرے ؛ ح، ل، ن : اک ؛ ش : یک

۲۷۷ یہ غزل تینوں مجموعوں میں موجود ہے — غ کے حاشیے میں، اور ح اور ش کے متن میں۔

۲۷۸ مصرعِ ثانی سب قدیم مآخذ میں م کے مطابق ہے۔ ن میں اس کی شکل یہ ہے :

غالب! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

۲۸۰ مصرعِ ثانی۔ غ : مونہہ

۲۸۱ یہ غزل صرف ح اور ش میں ملتی ہے۔

مصرعِ اولیٰ ش اور ل میں م کے مطابق ہے، لیکن ح کے حاشیے میں 'کہیں' کی جگہ تخلص 'اسد' لکھ کر اسے مقطع بنا دیا گیا ہے۔ یہی اب ن میں بھی ہے۔

۲۸۲ ح، ل : ذوق۔ نہ صرف ش میں بھی شوق ہے، بلکہ ن میں بھی اسی کے مطابق ہے۔

۲۸۳ ل : پردے

۲۸۴ یہ غزل۔ غ، ح، ش — تینوں میں ملتی ہے۔

ح : مجبور (یہ سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے)

۲۸۵ ل : نالے

۲۸۶ یہ غزل غ، ح، ش میں ملتی ہے۔

۲۸۷ ل : یاں تک ؛ ن : اس کو حسرتِ دیدار ہے۔

۲۸۸ ح، ل، ن : ترے

۲۸۹ یہ غزل غ، ح (حاشیہ) ش میں ملتی ہے، بلکہ ہر جگہ اس زمین میں دو دو غزلیں ہیں، جن سے یہ اشعار لیے گئے ہیں۔

۲۹۱ مصرعِ اولیٰ غ میں یوں ہے : نہیں ہوتا پرِیدن جلوہ رنگ از فرطِ خونریزی

سب سے اول ح میں متن م کے مطابق ہے؛ اور ش اور ل میں اسی کا اعادہ ہوا ہے۔
م میں سہو کاتب سے ردیف 'ہے' کی جگہ 'تھا' لکھا ملتی ہے؛ تصحیح کی گئی۔

۲۹۲ یہ غزل غ، ح، ش میں موجود ہے۔
غ میں مصرعِ اولیٰ کی یہ شکل ہے: یک لمحہ انتظار کی طاقت نہ لا سکی
م کی روایت سب سے پہلے ح میں ملتی ہے اور یہی ش میں بھی ہے۔

۲۹۳ غ میں اولاً یہ مصرع یوں تھا: از بسکہ اشک سوکھ گئے چشم میں، اسد!
بعد کو اسے قلمزد کر کے دوسرا مصرع لکھا جس میں تخلص غالب ہے اور جو م کے مطابق ہے۔
متداول دیوان میں یہ دونوں شعر نہیں ہیں، نہ اس زمین میں کوئی غزل ہی ملتی ہے۔

۲۹۴ یہ غزل غ (حاشیہ)، ح (حاشیہ) اور ش کے متن میں ملتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ح کی کتابت کے بعد کہی گئی یعنی اس کا زمانہ ۱۸۲۱ء سے بعد کا ہے اور ش کی کتابت (۱۸۲۶ء) سے پہلے کا۔

۲۹۹ اس وقت اس غزل کے تمام اشعار میں م کا متن ہی ہر جگہ ملتا ہے؛ لیکن اب ل میں مقطع کے مصرع اولیٰ کی شکل یوں ہے: یار سے چھیڑ چلی جائے، اسد!

۳۰۰ اس زمین میں ایک مختصر غزل غ میں ملتی ہے، لیکن م کے ان اشعار میں سے وہاں ایک بھی نہیں۔ ح اور ش میں بھی غزلیں ملتی ہیں اور وہیں سے یہ شعر منتخب ہوئے ہیں۔
مصرعِ ثانی میں ردیف 'سے' لکھی ملتی ہے، جو ظاہر ہے کہ سہوِ کاتب ہے۔

۳۰۱ ش میں مصرعِ ثانی میں سہوِ کاتب سے لفظ (کی) ساقط ہو گیا ہے۔

۳۰۴ یہ غزل تمام مآخذ میں موجود ہے، اور اشعار کا متن بھی م کے مطابق ہے، الّا یہ کہ غ اور ش میں آخری شعر (۳۰۵) میں 'کسی' کی جگہ 'کسو' ملتا ہے۔

۳۰۷ یہ غزل قدیم مآخذ میں سے کہیں بھی نہیں ملتی۔

۳۰۹ م: نامیدی (سہوِ کاتب)۔ ن سے درستی کی گئی۔
مصرعِ ثانی۔ ل، ن: اک

۳۱۰ یہ غزل غ میں نہیں ہے ؛ ح کے حاشیے میں اور ش کے متن میں ہے۔

۳۱۱ ح ، ل ، ن : مری۔ ل : خیمے

۳۱۲ یہ غزل غ اور ح میں نہیں ملتی ، البتہ ش کے متن میں ہے۔

مصرعِ اول۔ ش : ایک

۳۱۵ ش میں یہ اور اس سے بعد کا شعر قطعہ بند ہیں اور یہاں لفظ 'قطعہ' لکھا ہے۔

۳۱۶ ش ، ن : وہی

۳۲۱ ل : ہو رہا ہے جہاں میں اندھیرا

ش : سررشتہ داری

۳۲۲ ن : آہ زاری ہے

۳۲۳ ش : بیقراری کا حکم جاری ہے

ل میں اس کے بعد مندرجہ ذیل شعر بھی ملتا ہے :

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج پھر اس کی روبکاری ہو

۳۲۵ یہ غزل غ (حاشیہ) اور ش کے متن میں ہے۔

غ : قریب آشیانہ کے ؛ ل : آشیانے

۳۲۶ ل ، ن : واں ، یاں

۳۲۸ غ ، ش : جس کے دہم سے

غ : دل میں پڑے

۳۲۹ یہ غزل غ ، ح ، ش تینوں جگہ ملتی ہے

غ میں مطلع کا مصرعِ اولیٰ پہلے یوں تھا : بدگماں ! رحم کہ ، کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے۔

بعد کو اسے بدل کر م کے مطابق بنا دیا

۳۳۰ یہ شعر غ اور ح دونوں مجموعوں میں نہیں ملتا ؛ ش میں ہے

ل ، ن : یاں

۳۳۱ مصرعِ اولیٰ۔ غ : ہو جہاں تیرا دماغِ خوے نازک نیم مست

یہ شعر ن میں نہیں ہے

۳۳۲ یہ قطعہ (بلکہ وہ غزل ہی جس میں یہ قطعہ ہے) سفرِ کلکتہ کے زمانے میں کہا گیا۔ یہ نہ غ میں ہے، نہ ح میں؛ یہ غزل پہلی مرتبہ ش کے حاشیے میں ملتی ہے، اور اسی ہاتھ میں جس میں اس سفر کا آمدہ کلام لکھا گیا ہے۔

۳۳۶ یہ شعر ش میں نہیں ملتا۔ م اور ل میں اس کی موجودگی سے خیال ہوتا ہے کہ یہ غالباً گلِ رعنا کی ترتیب کے وقت کہا گیا تھا۔

۳۳۷ مصرعِ ثانی ؛ ش، ل : نے وہ سر در د شور؛ ن : نے وہ سر در د سوز (صحیح شور ہے، باقی سب جگہ سہو کاتب ہے)

۳۳۸ ش، ن : ایک

۳۳۹ یہ غزل صرف ح اور ش میں ملتی ہے، قدیم ترین ماخذ غ میں موجود نہیں ہے۔ م میں یہ پوری غزل انتخاب میں آگئی ہے۔

ح، ل، ن : مری

۳۴۱ ح، ل، ن : تری

۳۴۶ یہ غزل بھی بہت قدیم ہے، اور غ میں موجود ہے۔ قدرتاً اس سے بعد کے دونوں مجموعوں ح اور ش میں بھی ملتی ہے۔

ح، ل : یاں ۔ ن میں یہ شعر نہیں۔

۳۴۷ غ میں یہ شعر نہیں ملتا، پہلی مرتبہ یہ ح کے حاشیے میں ملتا ہے۔ گویا یہ (ح کی کتابت) ۱۸۲۱ء کے بعد اور ش کی کتابت سے پہلے کہا گیا کیونکہ موخرالذکر کے متن میں موجود ہے۔

۳۴۸ شروع میں اس شعر کا مصرعِ اولیٰ غ کے مطابق یوں تھا:

اسد! وہ گل کرے جس گلستاں میں جلوہ فرمائی

بعد کو جب تخلص غالب کرنے لگے، تو یہ مصرع بدل کر وہیں حاشیے میں یوں لکھ دیا، جیسے م میں ہے؛ ح، ش، ن میں بھی اسی طرح ہے۔

مصرعِ ثانی، ل : غنچہ دگل (سہو کاتب)

۳۴۹ اس زمین میں غ اور ح میں دو دو غزلیں ہیں؛ ش میں ایک ہی ملتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ح کی ایک غزل کے مقطع سے تخلص (غالب) کی جگہ 'عاقبت' لکھ کر اسے بھی شعر بنا کر غزل میں داخل کر دیا ہے۔

۳۵۰ غ میں موجود نہیں۔ ح، ل، ن: مرے

۳۵۲ یہ غزل قدیم ترین مجموعے غ سے غائب ہے، پہلی مرتبہ ح کے متن میں ملتی ہے۔
مصرعِ اولیٰ۔ ح، ن: منہ سے لگائے ہی بنے۔ لیکن ح میں یہ متن ٹھیک نہیں ہو سکتا جب کہ ش میں جو اسی پر مبنی ہے، یہ م کے مطابق ہے۔ ل میں بھی م کی طرح ہے۔

۳۵۵ ن: صلہ۔ مصرعِ ثانی میں کلمۂ ربط 'ہے' بشکلِ واحد لکھا ہے۔ حال آنکہ اور تمام مآخذ میں 'ہیں' بشکلِ جمع ملتا ہے۔

۳۵۷ پرانے ماخذوں میں صرف ش میں یہ غزل ملتی ہے، دوسرے دونوں اقدم مجموعوں سے غائب ہے۔
سب جگہ متن ایک سا ہے

۳۶۱ یہ غزل بھی غ اور ح میں موجود نہیں؛ صرف ش کے حاشیے میں ملتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سفرِ کلکتہ کے دوران میں کہی گئی تھی۔ م میں مکمل غزل ہے۔ میرے نزدیک یہ کلکتے کے قیام کے زمانے میں کہی گئی۔
مصرعِ اولیٰ۔ ش: کب سنے ہے وہ کہانی میری

۳۶۴ ل، ن: مرا

۳۷۰ یہ غزل بہت قدیم ہے؛ غ، ح، ش — تینوں جگہ ملتی ہے۔
مصرعِ اولیٰ۔ غ: تو وہ افسوں
مصرعِ ثانی۔ ح میں پہلی مرتبہ حاشیے پر دل کی جگہ غم بنایا گیا، لیکن ش کے متن تک یہ 'دل' ہی رہا۔ پھر 'غم' اختیار کر لیا گیا، چنانچہ اب ن میں غم ہی ہے۔

۳۷۲ یہ غزل صرف ش میں ہے۔
مصرعِ ثانی۔ ل، ن: اک،

۳۷۲ مصرعِ ثانی ، ن : یاں تو کوئی

۳۷۴۔۳۷۵ ش میں یہ دونوں قطعہ بند شعر اسی ترتیب سے ملتے ہیں، جیسے م میں ہیں؛ ن میں ان کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔

۳۷۴ مصرعِ اولیٰ ۔ ش ، ن : ایک

۳۷۶ یہ غزل تینوں قدیم مجموعوں میں موجود ہے۔
ش میں سہوِ کاتب سے اس شعر کے مصرعِ اولیٰ میں لفظ (ہی) ساقط ہوگیا ہے

۳۷۸ غ ، ح ، ش : جادو ہے طرزِ گفتگوے یار، اے اسد!
مصرعِ ثانی ۔ ح ، ل : یاں ۔ یہ شعر ن میں نہیں ملتا۔

۳۷۹ یہ غزل غ کے حاشیے میں ہے، اور ح اور ش کے متن میں ملتی ہے۔

۳۸۲ غ ، ح ، ش : کیا چلتی ہے۔

۳۸۴ یہ غزل غ، ح ، ش میں موجود ہے۔ لیکن ان چاروں شعروں میں سے ایک بھی غ میں نہیں ملتا۔
م میں مطلع کی ردیف 'سے' کی جگہ 'کو' لکھی ہے (سہوِ کاتب)
مصرعِ ثانی ۔ ل : مری

۳۸۵ مصرعِ ثانی ۔ ح : درد کی طرح (سہوِ کاتب)؛ ن : صورتِ دُود

۳۸۶ ن : اثرِ آبلہ سے جادۂ صحراے جنوں صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

۳۸۷ مصرعِ اولیٰ ۔ ح ، ل ، ن : اک آگ

۳۸۸ اس زمین میں غزل غ میں ملتی ہے، لیکن یہ شعر اس سے غائب ہے؛ یہ دراصل پہلی مرتبہ ح کے حاشیے میں اضافہ ہوا تھا۔ ش میں بھی ہے۔
مصرعِ ثانی ، ح : گو (ممکن ہے کہ یہ سہوِ کاتب ہو)

۳۸۹ یہ غزل ش میں ہے؛ دوسرے دونوں مجموعوں سے غائب ہے
مصرعِ ثانی ۔ ش ، ل ، ن : تری

۳۹۱ یہ غزل تینوں قدیم مجموعوں (غ ، ح ، ش) میں ملتی ہے۔

یہ شعر غ اور ح میں نہیں ہے اور میرا گمان ہے کہ مندرجۂ ذیل شعر، جو ان دونوں ماخذوں میں موجود ہے، اس کی اولین شکل ہے اور م کا یہ شعر اسی کی جگہ رکھا گیا :

بذوقِ شوخیِ اعضا تکلف بارِ بستر ہے
معافِ پیچتابِ کشمکش، ہر تارِ بستر ہے

م میں مصرعِ ثانی میں 'بار' کی جگہ 'خار' لکھا ہے، یہ سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے، اسی لیے ش سے درستی کی گئی۔

مصرعِ ثانی ۔ ل، ن : مرا

۳۹۲ مصرعِ اولیٰ ۔ غ، ح : بطوفانگاہ جوشِ اضطرابِ وحشت شبہا ۔ ش اور ل میں مصرع م کے مطابق ہے ۔ ن : اضطراب ۔ ح کے حاشیے میں پہلے مصرعے کو قلم زد کرکے، دوسرا مصرع ن کے مطابق درج کیا گیا ہے (ح میں اضطراب اور شام کے درمیان عاطفہ کی موجودگی سہوِ کاتب ہے)

۳۹۳ یہ غزل صرف ش میں ہے ۔

۳۹۴ مصرع ثانی ۔ ش : ایک

۳۹۵ اس زمین میں غزلیں غ اور ح میں بھی ہیں، لیکن م کے یہ دونوں شعر کسی میں بھی نہیں ؛ یہ پہلی مرتبہ صرف ش میں ملتے ہیں ۔

مصرعِ اولیٰ ۔ ش : مستِ تغافل

۳۹۷ یہ غزل تینوں جگہ ہے اس اختلاف کے ساتھ کہ غ میں مصرعِ اولیٰ میں 'سر بسر' کی جگہ لفظ 'چشمک' ملتا ہے ؛ ح اور ش میں م کے مطابق ہے ۔

۳۹۸ غ اور ح میں اس زمین میں غزلیں ملتی ہیں، لیکن ان میں اور م میں کوئی شعر مشترک نہیں ہے ۔ ش میں پہلی مرتبہ م کا ایک شعر (۴۰۱) اس میں شامل ملتا ہے ۔ بقیہ یہاں بھی دونوں پیشرووں کے مطابق ہیں ۔

۴۰۰ مصرعِ اولیٰ ۔ ل، ن : داں

۴۰۲ مصرعِ ثانی میں ن میں 'صید' کی جگہ 'محو'

۴۰۴ یہ غزل غ میں تو نہیں ہے، البتہ ح کے آخر اور ش کے متن میں ملتی ہے ؛ ل اور

ن میں بھی ہے۔ اور سب جگہ متن م کے مطابق ہے۔

۴۰۷ یہ غزل صرف ش میں موجود ہے۔ یہاں ن کے مطابق مکمل غزل انتخاب میں لے لی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دو ایک جگہ لفظ بدل دیا گیا ہے اور ایک شعر ترتیب میں دوسری جگہ رکھا گیا ہے۔

۴۰۸ مصرعِ اولیٰ۔ ل : آوارگی سے ہم (سہوِ کاتب)
م میں مصرعِ ثانی میں الفاظ 'طبیعتوں کے' کی جگہ بیاض ہے؛ ش سے خانہ پری کی گئی۔

۴۰۹ ش، ل، ن : پردے

۴۱۰ اس کی جگہ ش میں یہ شعر ملتا ہے :

پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ عشق   جوں شمع آپ اپنی وہ خوراک ہو گئے

ن : اپنی آگ کے

۴۱۱ ل : گلہ

۴۱۲ ش اور ن میں یہ شعر حسنِ مطلع ہے۔

۴۱۴ یہ غزل غ، ح، ش ــــ سب جگہ موجود ہے۔

۴۱۵ غ میں یہ شعر نہیں ملتا۔ ل، ن : عیش دوست
مصرعِ ثانی۔ ل، ن : واں؛ ل : نالہ

۴۱۶ یہ غزل بھی تینوں قدیم مآخذ میں ملتی ہے۔
مصرعِ اولیٰ۔ غ : شوخیِ اظہار ندا تھا۔ یہی پہلے ح میں بھی تھا، لیکن بعد کو اسے قلم زد کرکے م کے مطابق بنا دیا۔
مصرعِ ثانی۔ متن میں 'دعوہ' تھا؛ غ سے درستی کی گئی۔

۴۱۷ مصرعِ اولیٰ۔ غ اور ح ــ دونوں میں کلمۂ ربط واحد کی جگہ جمع (ہیں) بعد کو ح میں اسے بھی بدل دیا۔

۴۱۸ مصرعِ اولیٰ۔ غ اور ح میں یہ شعر نہیں ہے۔ ش، ل : شورش۔ ن میں م کے مطابق ہے۔
ش، ن : احباب۔ ل، ن : یاں

۴۱۹ ح اور ش دونوں میں اس زمین میں دو دو غزلیں ہیں؛ غ میں ایک بھی نہیں۔ یہاں انتخاب میں پہلے دو اور آخری یعنی تین شعر ایک غزل کے ہیں اور تیسرا دوسری غزل سے لیا گیا ہے۔

۴۲۳ اس زمین میں غزل تینوں قدیم مجموعوں میں موجود ہے، لیکن غ اور ح میں یہ شعر نہیں ملتا؛ یہ پہلی مرتبہ صرف ش میں آیا ہے۔

۴۲۴ غ اور ح میں دونوں جگہ اس زمین میں غزلیں ہیں۔ لیکن یہ شعر غ سے غائب اور ح کے بھی حاشیے میں ہے۔

۴۲۵ م میں مصرع ثانی میں (ش کی طرح) 'بتاں کے' ملتا ہے؛ ن سے تصحیح کی گئی۔ (بظاہر ح میں بھی 'کا' ہی ہے) یہ غزل غ میں ہے، لیکن اس میں یہ شعر نہیں ہے۔

۴۲۶ اس زمین میں غزل تینوں ماخذ میں ہے، البتہ م کے یہ چاروں شعر سب جگہ نہیں پائے جاتے مثلاً غ میں ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ یہ شعر (۴۲۶) کسی میں بھی نہیں ہے۔ (۴۲۷) ح اور ش ہے، یہی صورت (۴۲۸) اور (۴۲۹) کی ہے۔ (۴۳۰) پھر کسی میں بھی نہیں۔
ن : آئے یا نہ آئے : ل : یاں

۴۲۸ ل : یاں ہے

۴۲۹ مصرعِ اولیٰ م میں 'ہے' موجود ہے؛ یہ غالباً سہوِ کاتب ہے۔ اس کے بالعکس ل اور ن میں عاطفہ ملتی ہے اور یہی غالباً درست بھی ہے۔

۴۳۰ غ میں ایک پوری غزل ہے، لیکن یہ شعر وہاں سے غائب ہے۔ ح میں یہ شعر ان اشعار کی ذیل میں درج ہے، جن کی ہمطرح کوئی غزل متن میں نہیں ہے۔ ش میں البتہ ایک پوری غزل اس زمین میں موجود ہے اور اس میں یہ شعر بھی ملتا ہے۔

۴۳۱ یہ غزل تینوں ماخذ میں ہے، لیکن یہ مقطع غ سے غائب ہے؛ یہ صرف ح اور ش میں ہے

۴۳۳ یہ غزل بھی تینوں قدیم ماخذ میں ہے، لیکن یہ دونوں شعر نہ غ میں ہیں، نہ ح میں۔ ش میں (۴۳۳) موجود ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اسی شعر کے بعد مخطوطہ ناقص ہے؛ اور نہیں معلوم کہ اس میں سے کتنے ورق ضائع ہوگئے۔ لہٰذا نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شعر اس میں تھا، یا نہیں۔

۴۳۴ بہت قدیم غزل ہے؛ غ میں بھی ملتی ہے اور بعد کے مجموعوں میں بھی ضرور ہوگی۔ یہ اس لیے کہ

ش سے ردیف یا ے کے آخر کے ورق غائب ہیں اور یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ ح میں اس کی موجودگی اس پر دال ہے کہ یہ ش میں ضرور شامل ہوگی۔

مصرعِ اولیٰ۔ ل : شعلے

۴۲۶ مصرعِ ثانی۔ غ ، ح دونوں جگہ 'جز' کی جگہ 'اے' ملتا ہے۔ اس کے برعکس م اور ل میں 'جز' ہے۔ اب ن میں 'پھر اے' ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف اوقات میں یہاں ردو بدل کرتے رہے اور 'اے' کے لیے جو نئے معنی انھوں نے وضع کیے تھے، اس پر انھیں اطمینان نہیں تھا۔ افسوس کہ 'ش' کا یہ حصہ دستیاب نہیں ہوتا، ورنہ معلوم ہوتا کہ یہاں کیا صورت تھی۔

۴۲۹ یہ غزل صرف ش میں ہے، یہاں مکمل غزل انتخاب میں لے لی گئی ہے۔

۴۴۶ مصرعِ اولیٰ۔ ش : چاہے ہے

۴۵۰ متن میں 'مانگے ہے' ، لیکن اسے قلم زد کیے بغیر حاشیے میں 'ڈھونڈے' لکھا ملتا ہے۔ میں نے اسی لیے اسے متن میں داخل کر دیا ہے؛ یہی ل میں بھی ہے، اگرچہ وہاں 'ڈھونڈے' لکھا ہے؛ ن : چاہے

مصرعِ ثانی ش، ل : سرمے

۴۵۱ ش : ڈھونڈے ہے

۴۵۲ ل، ن : اک؛ ش : چاہے ہے

۴۵۳ ل، ن : ڈھونڈتا

۴۵۴ ن : جی میں ہے

۳— انتخاب فارسی

[انتخابِ فارسی کے حواشی میں نشانات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

کج : دیوانِ فارسی کا خطی نسخہ، کراچی، جو مولوی عبدالحق مرحوم کے ذاتی کتابخانے میں تھا۔

طا : دیوانِ فارسی طبع اوّل (۱۸۴۵ء) طب : دیوانِ فارسی طبع ثانی (۱۸۶۳ء)

ل : گلِ رعنا کا نسخہ، لاہور م : گلِ رعنا کا نسخہ، مالک رام

ک : کلّیاتِ نثرِ غالب (فارسی) (۱۸۶۸ء)

حواشی کے شروع میں ہندسے شعروں کی تعداد کے مطابق دیے گئے ہیں۔]

نثر فارسی

سطر ۳۔ ل میں 'نمط' کی جگہ 'غلط' چھپا ہے۔ یہ سہوِ کاتب ہے؛ صحیح نمط ہی ہے۔

قصیدہ

یہ قصیدہ مسٹر انڈریو اسٹرلنگ کی مدح میں ہے، اور اس وقت لکھا گیا جب کہ غالب اپنے پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہیں۔ وہ نومبر دسمبر ۱۸۲۶ء میں دلّی سے روانہ ہوئے اور فیروز پور جھرکہ، کانپور، لکھنئو، باندہ، الہ آباد، بنارس، مرشد آباد وغیرہ ٹھہرتے ہوئے ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ جب وہ گورنر جنرل کے دفتر میں گئے، تو یہاں ان کی اسٹرلنگ سے ملاقات ہوئی، جو اس زمانے میں گورنر جنرل کے فارسی دفتر کے سکتر تھے۔ انھوں نے اس ملاقات کا حال اپنے برادرِ نسبتی میرزا علی بخش خان کو لکھا ہے:

بالجملہ ایزدی نوازش ست از خوابِ خوش برخاستہ و رُوی ناشُستہ بدرگاہ آمدہ را در چشم و دل فرماندہان جای داد و در انجمن پایہ از خواہش برتر بخشید مستر اندرو استرلنگ نامی از اعیانِ کونسل دردِ دلِ دردمند شنوی و خستگی بندِ غم مرہم نہی بریکسیہای من بخشودہ است۔ ہر چند دل کہ عمری بہ ناامیدی خوی کردہ است، یکبارہ بپیوند آزرم و بدریں آمیزش نتواند گسیخت۔ لیکن اگر این جوانمرد توانا دل بجادو ی

تاثیرِ کام بخشی میانۂ من و یاس طرحِ جدائی جاوید افگندہ شگفت نیست (کلیاتِ نثر : ۴۷)
انھی ایام میں انھوں نے ایک اور خط صدر امینِ باندہ، مولوی محمد علی خان کو لکھا تھا، جس میں اسٹرلنگ سے اپنی ملاقات اور اس قصیدے کا بھی ذکر کیا ہے :

دیگر امیریست بارای و فرہنگ موسوم بہ اندرو استرلنگ کہ قوسِ عروجی کونسل را نقطۂ بدایت و قوسِ نزولی آن را نقطۂ نہایت است۔ چون سرمایۂ علم و آگہی دارد و سخن را می فہمد و بلطفِ سخن وا میرسد، در مدحِ وی قصیدۂ مشتمل بر پنجاہ و پنج بیت انشا کردم و در آخرِ قصیدہ لختی از حالِ خویشتن نگاشتم۔ از حسنِ اتفاق نہ بسعیِ کسی ملازمتش بروشی گزیدہ و آیینی پسندیدہ دست بہم داد۔ اعتبارِ خاکسار بہای من افزود و عیارِ امیدواریہای من کامل برآمد۔ قصیدہ گزراندم و پارۂ برخواندم۔ محظوظ شد و دلجوئیہا کرد و وعدۂ یارگیری داد۔ پوشیدہ نماند کہ استرلنگ بہادر عہدۂ چیف سکرتری دارد و منجملہ اجزاے کونسل بشمار می آید (کلیاتِ نثر : ۸، ۷-۹)

اس سے معلوم ہوا کہ جب یہ قصیدہ ممدوح کی خدمت میں پیش ہوا ہے، تو اس میں ۵۵ شعر تھے لیکن یہاں گلِ رعنا میں صرف ۵۴ شعر ملتے ہیں۔ البتہ دیوان فارسی طبع اول (۱۲۶۱ھ) اور طبع ثانی (۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) — دونوں جگہ شعروں کی تعداد ۵۵ ہی ہے؛
نسخۂ کچ (ص ۸۱) میں اس قصیدے کا عنوان ہے : سخن در شناسی داور و خوشخوئی بہشتی روی، بجاہ کیخسرو و بداد سنجر، مستر اندرو استرلنگ بہادر۔ طا میں اس قصیدے کا عنوان ہے (ص ۲۲۴): در ستایشِ مستر اندرو استرلنگ بہادر صاحب سکرتر۔ طب (ص ۲۸۲) میں کوئی عنوان نہیں ملتا؛ صرف الفاظ 'قصیدۂ سی و نہم' دیے ہیں۔

۶ م کا یہ شعر کچ میں نہیں ہے؛ دیوان میں بھی نہیں ملتا، نہ طا میں ہے نہ طب میں۔ اس کی جگہ وہاں (اور ل میں بھی) مندرجۂ ذیل شعر ملتا ہے، البتہ (۷) کے بعد :

فغان کہ جان بغمت دادم و تو دانستی | کہ جان دہند وفا پیشگان بآسانی

۹ کچ، طا، طب : داورانِ دہر

۱۵ ل : کاندریں محیط؛ اور سب جگہ بساط ہے۔

۲۱ ل : قصد؛ اور سب جگہ : قصر۔ کچ، طا : بالمبالغہ

۲۲ ل : لطائف۔ یہ غالباً سہوِ کاتب ہے۔ اور سب جگہ 'لطافت' ہی ہے اور مصرعِ ثانی میں 'نزاکت' کی موجودگی میں لطافت ہی بہتر ہے۔

۲۳ کچ، طا، طب : بزرمِ قبولش

۲۴ کچ، طا، طب : عُمّانی (بجائے طوفانی)

۲۸ مصرعِ اولیٰ۔ ل : نہفت و می ترسم
مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب : غیبت (بجائے غیب)

۳۰ طب میں اس سے پہلے جلی عنوان 'مطلعِ ثانی' ملتا ہے۔ م میں اس سے قبل خالی جگہ ملتی ہے، غالباً یہی عنوان یہاں لکھنا مقصود تھا۔

۳۲ م : معجزہ (سہوِ کاتب)

۳۵ م : صفہانی۔ اور سب جگہ 'صفاہانی' ہے۔ لہذا یہاں بھی تبدیلی کر دی گئی ہے۔
کچ، طا، طب میں اس کے بعد مندرجۂ ذیل شعر زاید ہے :
بذوقِ نعمتِ خوانت چناں بحرص افتاد   کہ در دہانِ صدف کرد آب دندانی

۳۸ مصرعِ اولیٰ سے 'چو' حذف کر کے کچ، طا، طب میں مصرع یوں کر دیا گیا ہے :
منِ شکستہ دلِ بینوائی ہیچمدان
نیز مصرعِ ثانی میں زند کو بصیغۂ واحد متکلم 'زنم' کر دیا گیا ہے۔

۳۹ کچ، طا، طب میں اس کے بعد مندرجۂ ذیل شعر زاید ملتا ہے :
ز نالہ ام چہ محاباکہ، معدلت کیشی   ز گریہ ام چہ خجالت کہ، از کریمانی

۴۲ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب : میشود (بجائے میرود)

۴۶ سب جگہ 'فشاندہ' کی جگہ فشاند و (عاطفہ)

۴۷ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب : کشید (بجائے کشیدہ)
مصرعِ ثانی۔ م : کہ زعجز بال؛ سہوِ کاتب۔ 'کہ' زاید ہے۔ ل : از عجز؛ سہوِ کاتب، صرف 'ز' درکار ہے؛ کچ، طا، طب : بہ بندِ عجز

۵۰ یہ شعر م اور ل کے علاوہ اور کسی مجموعے میں نہیں ملتا۔

۵۱ کچ، طا، طب: (سخن رانی کی جگہ) ثنا خوانی

۵۳ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: مدام (ہمیشہ کی جگہ)

۵۵ یہ قطعہ بھی مندرجہ صدر قصیدے کی طرح کلکتے میں لکھا گیا، جیسا کہ شعر ۶۸ سے اور اس کے بعد کے متعدد اشعار سے ظاہر ہے۔ م میں اس پر کوئی عنوان نہیں ہے، لیکن اور سب جگہ (بشمولِ ل) اس پر 'قطعہ' کا عنوان ملتا ہے۔

۵۶ مصرعِ ثانی۔ ل: ترکتاز ہم

۵۷ ل کے علاوہ اور سب جگہ 'بیخودی' کی جگہ 'سرخوشی'

۶۲ مصرعِ اولیٰ۔ ل، کچ، طا، طب: گفتم "ایں حبِ جاہ و منصب چیست؟"

۶۴ کچ، طا، طب: اکنوں بگو

۶۵ کچ، طا، طب: شاہدی مست

۶۶ کچ، طا، طب میں یہ شعر (۶۷) سے موخر ہے، اور یہ ترتیب بہتر ہے۔ کیونکہ (۶۷) میں عظیم آباد کا ذکر ہے اور یہاں 'سوہن' کا جو نواحِ عظیم آباد (پٹنہ) میں ایک دریا (ندی) ہے۔ ل میں بھی ترتیب م کے مطابق ہے۔

۶۷ ل میں مصرعِ اولیٰ م کے مطابق ہے، اور سب جگہ: گفتمش "چون بود عظیم آباد"

۷۰۔۷۱ کچ، طا، طب میں مقدم و مؤخر ہیں

۷۷ قطعہ (۳) ل میں قطعہ (۲) سے پہلے ہے۔ یہ قطعہ کچ، طا، طب میں منظومات میں شامل کرنے کی بجائے دیباچے کا حصہ ہے۔ اور اشعار کی ترتیب بہت مختلف ہے۔ ان تینوں مجموعوں میں شعر (۷۷) کی جگہ مندرجۂ ذیل شعر ملتا ہے:

مزرعِ خویش را بگاہِ دِرَو ناخنِ حور وقفِ داس کنم

۷۸ کچ، طا، طب میں نہیں ملتا

۷۹ کچ، طا، طب: نتوانم

۸۱ کچ، ل: باستانی

۸۴ کچ، طا، طب: ترکِ آرائشِ لباس کنم

۸۵ مصرعِ اولیٰ۔ ل: نذرِ امید ہای بیہودہ ؛ کچ، طا، طب میں شعر یوں ملتا ہے:

بر مدارا اگر مدار نہم کاخِ الفت قوی اساس کنم

اور ہر جگہ اس کے بعد حسبِ ذیل شعر زاید بھی شامل ہے:

لیک ناید زمن کہ در گفتار مدحتِ لالہ سُور داس کنم

۸۶ یہ شعر کچ، طا، طب میں نہیں ملتا

۸۷ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: نہ بواجب زسعی دامانم

مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: (کہ کی جگہ) نہ۔ چونکہ مصرعِ اولیٰ بدل دیا گیا تھا، اس لیے 'نہ' درست ہے۔

۸۸ یہ شعر ل کے سوا اور کسی جگہ نہیں ملتا۔

۹۰ یہ شعر بھی ل کے علاوہ اور کسی مجموعے میں نہیں ہے۔ اور ل میں بھی (اور دوسرے تینوں مجموعوں میں بھی) اس کے بعد یہ مزید بیت ملتی ہے:

توسنِ طبعِ من بدان آزرد کہ ز بالِ پری قطاس کنم

۹۴ مصرعِ ثانی۔ سب جگہ: مساس

۹۵ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: انداز (بجائے آہنگ)

اور تمام جگہ اس کے بعد یہ مزید بیت شاملِ قطعہ ہے:

چہ ازیں فرقۂ ادا نشناس خویشتن را ہلاکِ یاس کنم

۹۶ کچ، طا، طب میں اس کی جگہ یہ شعر ملتا ہے:

بدو بیتے زگفتہائے حزیں صفحہ را طرۂ ایاس کنم

۹۷-۹۸ یہ دونوں شعر حزیں کے ایک قطعہ کے ہیں، جو غالب نے بطور تضمین استعمال کیے ہیں (کلیاتِ حزیں: ۱۴۹) یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ قطعۂ حزیں میں پہلا اور آخری شعر ہیں۔

۹۹ کچ میں اس مثنوی کا عنوان ہے: مثنوی موسوم بچراغِ دیر۔ طا میں اس سے پہلے لفظ "سیومین" کا اضافہ ہے اور طب میں 'سومین' کا۔

۱۰۰ مصرعِ اولیٰ ۔ ل : دل تنگم ۔ اور سب جگہ رگ ہی م کے مطابق ہے۔

۱۰۲ کچ، طا، طب : نفس خون کن جگر پالافغانی

۱۰۳ مصرعِ اولیٰ ۔ کچ، طا، طب : پریشان تر ز زلفم

۱۰۷ مصرعِ ثانی ۔ سب جگہ 'افسردہ' کی بجائے افشاندہ ۔ یہ م کے کاتب کا سہو بھی ہو سکتا ہے۔

۱۰۹ کچ، طا، طب میں اس کے بعد مندرجۂ ذیل چار شعر کا اضافہ ہے :

ز اربابِ وطن جویم سہ تن را	کہ رنگ و رونق اند این نہ چمن را
چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم	ہم از حق فضل حق را باز خواہم
چو حرزِ بازوی ایمان نویسم	حسام الدین حیدر خان نویسم
چو پیوندِ قبای جان طرازم	امین الدین احمد خان طرازم

۱۱۰ مصرعِ ثانی ۔ کچ، طا، طب : مرایناں (بجای عزیزان) ۔ جب مندرجۂ صدر چار شعروں میں ان تینوں دوستوں کے نام لکھ دیے، تو اب 'عزیزان' کے کنایے کی کیا ضرورت رہ گئی؛ صراحت سے 'مرایناں' کا اشارہ کر دیا۔

۱۱۱ مصرعِ اولیٰ ۔ کچ، طا، طب : بوستان (بجاے انجمن)

مصرعِ ثانی ۔ کچ، طا، طب : این دوستان (بجاے اہل وطن)

۱۱۲ م : سپس در لالہ زار جان توان کرد (سہوِ کاتب)

۱۱۳ مصرعِ ثانی ۔ کچ، طا، طب : (بوستانی کی جگہ) گلستانی

۱۱۴ مصرعِ اولیٰ ۔ م : جہانا باد

۱۱۶ مصرعِ ثانی ۔ م : جہانا باد

۱۱۷ مصرعِ اولیٰ ۔ م : دعوہ

۱۱۸ مصرعِ اولیٰ ۔ کچ، طا، طب : مینو تماشی

۱۲۲ ل، کچ، طب : دیدست؛ طا : دیداست

۱۳۰ مصرعِ ثانی ۔ طا، طب : آب و خاک

۱۳۱ مصرعِ ثانی ۔ ل، اور طب میں عاطفہ نہیں ہے؛ اور یہ بہتر صورت ہے۔ ممکن ہے کہ جہاں

ملتی ہے، وہاں یہ سہوِ کاتب کا نتیجہ ہو۔

۱۳۴ کچ، طا، طب ــــ تینوں جگہ اس کے بعد مندرجۂ ذیل شعر زاید ملتا ہے:

بہاران در شتا و صیف ز آفاق — بہ کاشی میکند قشلاق و ئیلاق

۱۳۸ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: صندل (بجائے قشقہ)

۱۴۰ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: عباد تخانہ

۱۴۱ اور سب جگہ: ہیولیٰ

۱۴۲ م: توان نا (سہوِ کاتب)

۱۴۳ مصرعِ ثانی۔ ل: بدنہا (غالباً سہوِ کاتب)

۱۴۵ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: خونِ عاشق؛ ل: گرم رَو (غالباً سہوِ کاتب)

۱۴۸ ہر جگہ: بہ تن

۱۵۲ مصرعِ ثانی۔ م: موج (سہوِ کاتب)

۱۵۴ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: ز نغزی

۱۵۸ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: نیاز (غالباً سہوِ کاتب)

۱۶۰ مصرعِ ثانی۔ م: شمر (سہوِ کاتب)

۱۶۵ یہ شعر کچ، طا، طب سے ساقط ہے۔

۱۷۱ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: بدین

۱۷۲ مصرعِ ثانی۔ م: چیست۔ اور سب جگہ: کیست؛ اور یہی درست ہے۔ لہٰذا اصلاح کی گئی۔

۱۷۳ مصرعِ اولیٰ۔ طب: سُو

۱۸۴ م: دعوہ (اصلاح کی گئی)

۱۸۵ م: لخت۔ اور سب جگہ لختی؛ اور یہی درست ہے۔ اسی لیے درستی کی گئی۔

۱۸۸ کچ، طا، طب: آتشِ دل

۱۹۱ طب کے سوا سب جگہ (بشمولِ م) آذر (بذال منقوطہ)۔ چونکہ غالب فارسی میں ذال کے

قائل نہیں تھے، اس لیے درستی کی گئی۔ اس کی یہ بھی توجیہ ہو سکتی ہے کہ ان کا یہ نظریہ بعد کے زمانے کا ہو، اسی لیے صرف طب میں یہ لفظ دال سے لکھا ملتا ہے۔

۲۰۲ کچ، طا، طب : ماسوئی

غزلیات

۲۰۳ یہ غزل کچ (۱۰۷ ب)، طا (۴۴۳)، طب (۵۰۵) — تینوں مجموعوں میں ملتی ہے۔
م : بفضل (سہوِ کاتب)

۲۰۷ مصرعِ اولیٰ، کچ، طا، طب : خدایا! از عزیزان منتِ شیون کہ برتابد؛ م : ز خویش (سہوِ کاتب)، اور سب جگہ : ز خویشان : یہی درست بھی ہے؛ اسی لیے اصلاح کر دی گئی ہے۔
مصرعِ ثانی۔ طب : خان و مان

۲۱۱ مصرعِ اولیٰ۔ م :

۲۱۳ یہ غزل بھی تینوں مآخذ میں موجود ہے (کچ : ۸۶؛ طا : ۲۴۵؛ طب : ۳۵۶)
مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب : عرضِ یکرنگی

۲۱۴ مصرعِ ثانی۔ م : خضرہ (سہوِ کاتب)

۲۱۸ مصرعِ ثانی میں تقاضا کی جگہ بیاض ہے۔ دوسرے مآخذ سے اضافہ کیا گیا۔

۲۲۳ یہ غزل بھی سب جگہ ہے (کچ : ۱۴۷؛ طا : ۳۸۸؛ طب : ۴۶۳)

۲۲۴ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب : شوق

۲۲۸ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب : در نوردِ

۲۳۳ کچ : ۱۸۲ ب، طا : ۴۷۰، طب : ۵۲۶

۲۳۵ ل : کز ز عجز (سہوِ کتابت یا طباعت)

۲۳۷ م : نوامیدی (سہوِ کتابت)، وزن بھی درست نہیں رہتا

۲۴۱ اس مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل بھی سفرِ کلکتہ کی فتوح ہے، بلکہ ممکن ہے کہ کلکتہ ہی میں کہی گئی ہو۔

۲۴۲ یہ غزل یقیناً کلکتہ میں کہی گئی، جیسا کہ مقطع سے عیاں ہے۔ دیکھیے کچ ۱۶۱ ب؛ طا : ۴۲۲؛ طب : ۴۹۰

مصرعِ اولیٰ۔ م :. بحو نباب (درستی کی گئی۔ سہوِ کتابت)

۲۴۳ مصرعِ ثانی ۔ کچ، طا، طب : از شعلۂ تو

۲۴۶ مصرعِ ثانی ۔ م : خونناب (درستی کی گئی۔ سہوِ کتابت)

۲۴۷ مصرعِ ثانی ۔ ل : روی دہر

۲۴۸ یہاں نواب سے مراد نواب احمد بخش خان والیِ فیروز پور جھرکا و لوہارو ہیں۔ ان کا اکتوبر ۱۸۲۷ء میں انتقال ہوا۔ جب یہ خبر غالب کو ملی ہے، تو دورانِ سفر میں وہ مرشد آباد میں تھے۔ یہاں ان کی رحلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (دیکھیے، ک : ۴۷)

بعد کو بدل کر یہ مصرع یوں کر دیا تھا : از سینہ داغ دوریِ احباب شستہ ایم (کچ، طا، طب)

ل میں مقطع سے قبل مندرجۂ ذیل شعر بھی ملتا ہے :

جان در ہجومِ جلوۂ قاتل صفا گرفت   گویی، کتانِ خویش بمہتاب شستہ ایم

۲۴۹ دیکھیے کچ : ۱۶۱ ب ؛ طا : ۴۲۱ ؛ طب : ۴۸۹

مصرعِ اولیٰ ۔ کچ، طا، طب : از شوقِ تو

مصرعِ ثانی ۔ کچ، طا، طب : دلِ پروانہ

۲۵۰ م : آذر۔ طب : آدر۔ اور یہی اسلوبِ غالب کے مطابق ہے اسی لیے یہاں اختیار کیا گیا۔

۲۵۲ م : بخورشید ؛ کچ، طا، طب :. بخرشید۔ یہی غالب کے اسلوب کے مطابق ہے، اسی لیے تبدیلی کی گئی۔ ل : خورشید

۲۵۳ کچ، طا، طب میں مصرعِ اولیٰ میں تعب اور طرب کی جگہ ایک دوسرے سے بدلی ہوئی ہے۔

۲۵۴ مصرعِ اولیٰ ۔ کچ، طا، طب : ہرچند

۲۵۷ مصرعِ اولیٰ ۔ کچ، طا، طب : راز دارِ تو و بدنام کنِ گردشِ چرخ

۲۵۸ سُوہن ایک ندی ہے، عظیم آباد (پٹنہ) کے جوار میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ غزل عظیم آباد کے قیام کے دوران میں کہی گئی تھی۔ سوہن اور اس کے پانی کی خوبی کا ذکر اور بھی کئی جگہ کیا ہے مثلاً مندرجۂ صدر قطعہ میں بھی ہے۔ بعض غزلیات میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ایک رباعی بھی اس کی مدح میں کہی ہے۔

۲۵۹ کچ: ۱۲۴؛ طا: ۳۳۲؛ طب: ۴۲۰

۲۶۲ یہ شعر پنج آہنگ میں موجود ہے (آہنگ سیوم۔ طبع اول: ۱۰۹؛ طبع دوم: ۱۰۶؛ کلیاتِ نثر: ۲۲) اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ یہ غزل ۱۸۲۵ء میں کہی جا چکی تھی۔ لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ آہنگ سیوم میں شعروں میں اضافہ بعد کو بھی ہوا ہے۔

۲۶۶ مصرعِ اولیٰ۔ طب: بی پروائی (سہوِ کاتب۔ اس سے وزن تک غلط ہو جاتا ہے)
مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: مائیم سرشکی

۲۶۸ کچ: ۱۲۶؛ طا: ۳۳۶؛ طب: ۴۲۴

۲۷۰ مصرعِ ثانی، کچ، طا، طب: پردہ سرایان

۲۷۲ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: بصحنِ میکدہ سرمست
مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: بکنجِ صومعہ وقفِ نماز باید بود

۲۷۳ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: جلوہ گراید

۲۷۴ سب جگہ تپیدہ بتائے فوقانی ہے۔ غالب کے نزدیک 'ط' فارسی میں ہے ہی نہیں۔

۲۷۵ م: مگر نہفتہ (سہوِ کاتب) درستی کی گئی

۲۷۷ مصرعِ ثانی۔ طب: تراکہ با این ہمہ بابرگ و ساز باید بود (سہوِ کاتب)

۲۷۸ کچ: ۹۱؛ طا: ۲۵۷؛ طب: ۳۶۵

مصرعِ اولیٰ۔ ل، کچ، طب: 'قطرگی'۔ اگرچہ م کی طرح طا میں بھی 'قطرہ گی' ملتا ہے، لیکن صحیح 'قطرگی' (بدون ہائے ہوز) ہی ہے۔ اسی لیے یہاں درستی کر دی گئی ہے۔

۲۸۰ مصرعِ اولیٰ۔ سب جگہ: ہمند

۲۸۱ مصرعِ اولیٰ۔ ل، م: از حد گذشت شملہ و دستار ریش شیخ (سہوِ کاتب) اور سب جگہ متن کے مطابق۔ گذشت کا املا غالب کے اسلوب پر کر دیا گیا ہے۔

۲۸۴ یہاں ظہوری سے اپنی عمومی عقیدت کا اظہار مقصود ہے، ورنہ ظہوری کے دیوان (نولکشور، کانپور) میں اس زمین میں کوئی غزل نہیں ملتی۔

۲۸۵ مصرعِ اولیٰ۔ ل، طب: کشم۔ مصرعِ ثانی کی ردیف 'ما' کے پیشِ نظر مصرعِ اولیٰ میں بھی ضمیر جمع متکلم

ہی درکار ہو گی۔

۲۸۶ کچ: ۱۲۷ ب ؛ طا: ۳۳۹ ؛ طب: ۴۲۶
مصرعِ ثانی۔ م: بگذارند (سہوِ کاتب)

۲۸۹ مصرعِ ثانی۔ م: میزیبد از (سہوِ کاتب)

۲۹۰ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: خونِ ہزار سادہ بگردن گرفتہ اند

۲۹۱ مصرعِ ثانی۔ م: از دہن (سہوِ کاتب)

۲۹۵ کچ: ۹۱؛ طا: ۲۵۸؛ طب: ۳۶۵

۳۰۰ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: چشمِ تو

۳۰۴ مصرعِ ثانی۔ م: دامن (سہوِ کاتب)

۳۰۷ کچ: ۱۷۹ ب؛ طا: ۴۶۳؛ طب: ۵۲۰

۳۰۸ مصرعِ اولیٰ۔ ل: دلے (اور سب جگہ م کے مطابق دل ہی ہے)

۳۱۶ کچ، طا، طب میں اس مقطعے کی جگہ حسبِ ذیل مقطع ملتا ہے:
آہن چہ دادِ غمزۂ سحر آفرین دہد غالب بجز دلش نبود در خور آئینہ

۳۱۷ کچ: ۱۰۷؛ طا: ۲۹۱؛ طب: ۳۸۹

۳۲۱ م: اوفتادگی

۳۲۶ کچ: ۱۲۱؛ طا، ۳۲۶؛ طب: ۴۱۶

۳۲۷ ل، م: گذار (اسلوبِ غالب کے مطابق اصلاح کی گئی) اور تینوں مجموعوں میں زائے ہے۔

۳۳۴ مصرعِ اولیٰ۔ م: افتیم۔ اور سب جگہ اوفتیم باضافۂ واو ملتا ہے، اور یہی درست ہے۔ واو کے بغیر وزن ہی خبط ہو جاتا ہے۔

۳۳۵ کچ: ۱۰۴ ب؛ طا: ۲۸۵؛ طب: ۳۸۵

۳۳۸ مصرعِ ثانی۔ م: تارِ جیب (سہوِ کاتب)

۳۴۰ مصرعِ ثانی۔ ل، م: رہگذرش (اسلوب غالب کے مطابق زائے بنا دیا گیا) کچ، طا، طب میں بھی زائے ہے۔

۳۴۲ مصرعِ ثانی ۔ ل : چو نغمہ کہ وجودش ہنوز در تار ست ۔ اور سب جگہ م کے مطابق ۔ م میں سہوِ کاتب سے قافیہ و ردیف 'تار است' کی بجائے 'تارش' لکھا ہے ۔

۳۴۶ کچ : ۱۰۶ ب ؛ طا : ۲۹۰ ؛ طب : ۲۸۹

۳۴۷ مصرعِ ثانی ۔ م : چشم (سہوِ کاتب) اور سب جگہ 'چشمہ' ۔ اصلاح کی گئی ۔

۳۴۹ م میں دو جگہ سہوِ کاتب کے آثار ہیں : مصرعِ اولیٰ میں ضعفم کی جگہ ضعف، اور مصرعِ ثانی میں مُیرم' کی جگہ میروم ۔ اور سب جگہ متن اسی طرح ہے، جیسا یہاں درج ہے ؛ اسی سے اصلاح کی گئی ۔

۳۵۱ مصرعِ اولیٰ ۔ ل : بر قضا باشد (سہوِ کاتب)

۳۵۲ مصرعِ اولیٰ ۔ ل : چیموُد از ہستی

۳۵۳ مصرعِ اولیٰ ۔ ل : م : بگذشتن (اصلاح کی گئی)
مصرعِ ثانی ۔ کچ ، طا ، طب : ہان و ہان ، خدا دشمن ! انچہ بدگمانیہاست

۳۵۵ مصرعِ ثانی ۔ کچ ، طا : چہ سخت جانیہاست

۳۵۷ ظہوری کے دیوان (نولکشور، کانپور) اور کلیاتِ صائب (طبع امیری فیروز کوہی، ایران) دونوں میں اس زمین میں کوئی غزل نہیں ملتی ۔ غالب نے یہاں ان سخن گسترانِ پیشین کا نام ان سے برابری کے اظہار کے لیے کیا ہے ۔

۳۵۸ کچ : ۱۲۵ ب ؛ طا : ۳۲۵ ؛ طب : ۳۲۳

۳۶۲ مصرعِ ثانی ۔ ل ، م ، طب : گذشتہ (اصلاح کی گئی)

۳۶۳ مصرعِ ثانی ، سب جگہ : دکان

۳۶۵ مصرعِ ثانی ۔ م : زندان (سہوِ کاتب)

۳۶۸ کچ : ۱۷۱ ب ؛ طا : ۵۴۴ ؛ طب : ۵۰۷

۳۷۱ مصرعِ ثانی ۔ ل : حرف گداز

۳۷۳ م : معانی ہاے (سہوِ کاتب) ۔ کچ ، طا ، طب : بسکہ فکرِ معنیِ نازک ہمی کاہد مرا

۳۷۶ مصرعِ ثانی ۔ کچ ، طا ، طب : ذوق (شوق کی جگہ)

۳۷۷ مصرعِ اولیٰ ۔ کچ ۔ طا ۔ طب : لذتِ زخم

۳۷۸ کچ : ۱۷۲ ؛ طا : ۳۴۸ ؛ طب : ۵۰۹

۳۸۱ مصرعِ اولیٰ ۔ ل ، طب : مردمست

۳۸۲ مصرعِ ثانی ۔ کچ ، طا ، طب : کو راست ۔ م میں مصرع میں کتابت کی غلطی ملتی ہے ۔

۳۸۴ م : ہمچوازما (سہوِ کاتب) اور سب جگہ 'ہمچو ماز' ؛ اور یہی صحیح ہے ۔ لہذا درستی کی گئی ۔

۳۸۵ ل ، م : نگذرد (اسلوبِ غالب کے مطابق تبدیلی کی گئی)

۳۸۶ سب جگہ : مردنست ؛ م : گران زیستن (سہوِ کاتب)

۳۸۷ یہ شعر کچ ، طا ، طب میں نہیں ملتا ۔ اس کے بجائے مندرجہ ذیل شعر ان مجموعوں میں ایسا ہے ، جو ل ، م میں نہیں ہے :

دیدہ گر روشن سوادِ ظلمت و نورست ، چیست
فارغ از اہرمن و غافل زیزدان زیستن

مصرعِ ثانی ۔ ل : بے ہنگامہ (بجائے م : تا ہنگامہ)

۳۸۸ ل ، طا ، طب : خوشست

۳۸۹ کچ : ۱۲۳ ب ؛ طا : ۳۳۱ ؛ طب : ۴۲۰ ۔ ل میں خلافِ معمول اس غزل کے اشعار کی ترتیب بالکل مختلف ہے ۔ باقی تینوں مجموعوں میں ل کے مطابق ہے ۔

۳۹۰ م : گر دہم شرح عتاب عتابی کہ بدلہا داری (سہوِ کاتب)

۳۹۱ مصرعِ اولیٰ ۔ کچ ، طا ، طب : مترس (بجائے منال)

۳۹۴ یہ شعر کچ ، طا ، طب کسی مجموعے میں نہیں ملتا ۔ اس کے برعکس سب جگہ (بشمول ل) یہ شعر زائد ہے :

باقدت سرو چو شخصی ست کہ ناگہ یکبار   بیخود از جاز ہجوم خفقان بر خیزد

ل : کشتۂ دعوت (سہوِ کتابت) ؛ کچ ، طا ، طب : خولیتیم ہمہ

۳۹۵ مصرعِ اولیٰ ۔ م : میرسی (سہوِ کاتب)

۳۹۷ م : مجزو (سہوِ کتابت)

یہی وہ شعر ہے جس پر سرِ مشاعرہ لوگوں نے قتیل کی سند پر تین تین اعتراض کیے تھے :

۱   ہمہ عالم کی ترکیب غلط ہے ؛ عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ سے نہیں ہو سکتا۔
۲   بیش کی جگہ صیغۂ تفضیل بعض بیشتر ہونا چاہیے۔
۳   موی زمیان کی ترکیب غلط ہے۔

چونکہ یہ اعتراض قتیل کی سند پر کیے گئے تھے، اس لیے میرزا نہ صرف قتیل ہی کے مخالف ہو گئے (اور پھر مدت العمر رہے) بلکہ وہ تمام ہندستانی فارسی گویوں کے منکر ہو گئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے، ذکرِ غالب : ۷۶)

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل کلکتہ میں کہی گئی تھی۔

۳۹۸   ل ، کچ ، طا : آزر ؛ طب : آدر (بہت سے خطی نسخوں میں بھی آدر ہی ہے، بدالِ معجمہ)

۳۹۹   یہ مقطع بھی اس غزل کے کلکتہ میں کہے جانے پر دال ہے۔ اس میں غالباً اپنی پنشن کی طرف تلمیح ہے۔

۴۰۰   کچ : ۸۸ ب ؛ طا : ۲۵۱ ؛ طب : ۳۶۰

۴۰۲   مصرعِ اولیٰ۔ م : نہنگِ اما (سہوِ کاتب) اور سب جگہ "لا" ہے اور یہی درست ہے۔

۴۰۳   مصرعِ اولیٰ۔ کچ ، طا ، طب : ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت

اس غزل کے ساتھ اردو کی یہ غزل دلچسپی سے دیکھی جائیگی، جو غ ، ح میں ملتی ہے۔ غ کا متن ملاحظہ ہو، حاشیے میں اختلافِ نسخ ہے:

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکبہا
کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابیہاے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں زقالبہا[۱]
نہیں در پردہ حسن از کوششِ مشاطگی غافل[۲]
کہ ہے تہ بندیِ خط سبزۂ خط در تہِ لبہا

۱۔ ح : بیرونِ قالبہا

۲۔ ح : کرے ہے حسنِ خوباں پردے میں مشاطگی اپنی

عیادت ہائے طعن آلودِ یاران زہرِ قاتل ہے
رفوے زخم کرتے ہیں[3] بنوکِ نیشِ عقرب ہا
فنا کو عشق ہے بیمقصدان، حسرت پرستاراں!
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رَو پابندِ مطلبہا
اسد کو بت پرستی عالم دردِ آشنائی ہے[4]
نہاں ہے نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

۴۰۶ کچ: ۹۲ ب؛ طا: ۲۶۰؛ طب: ۳۶۷

۴۰۸ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: از دردِ بجوشد

۴۱۰ مصرعِ ثانی۔ طا، طب: بر قند نہ بر شہد نشیند مگسِ ما

۴۱۱ مصرعِ اولیٰ۔ طا: خیالم (سہوِ کاتب)

۴۱۴ کچ: ۹۲؛ طا: ۲۵۹؛ طب: ۳۶۶

۴۱۷ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: نفسِ باختۂ ما

۴۲۱ کچ: ۱۰۰ ب؛ طا: ۲۷۶؛ طب: ۲۷۸

مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: جنون محمل بصحرای

۴۲۲ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: خیالِ وحشت از ضعفِ رواں صورت نمی بندد

۴۲۳ م میں مصرعِ اولیٰ میں آخری (را) ساقط ہو گیا تھا (سہوِ کاتب)؛ اضافہ کیا گیا
مصرعِ ثانی۔ م: کوکب (سہوِ کاتب)

۴۲۶۔ کچ: ۱۰۳ ب؛ طا: ۲۸۳؛ طب: ۲۸۲

۴۲۷۔ مصرعِ اولیٰ۔ ل: فریبِ آشتی دہ، این ظفر مبارکباد (یہ غلط معلوم ہوتا ہے)
اور سب جگہ م کے مطابق ہے۔

۴۲۸۔ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: نامہ سپار

۳۔ ح: کرتی ہے

۴۔ ح: اسد کو بُت پرستی سے غرض دردِ آشنائی ہے۔

۴۲۹ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: مگر ز پارۂ سنگم کہ ریز دت.... الخ

۴۳۱ مصرعِ ثانی۔ ل: برتر (سہوِ کاتب)

۴۳۵ کچ: ۱۲۲ ب؛ طا: ۳۲۹؛ طب: ۴۱۸

۴۳۸ ل: بردائی۔ یہ شعر بعد کے کسی مجموعے میں نہیں ملتا۔

۴۳۹ مصرعِ اولیٰ۔ ل، کچ: محضرِ رسوائیِ ماست (یہ غالباً سہوِ کتابت ہے) طا، طب مطابقِ م
مصرعِ ثانی۔ کچ، طا: گرپیِ مور؛ طب: کزپیِ مور

۴۴۰ م: راز سینہ (سہوِ کاتب) اصلاح کی گئی۔ ل: نریزم بیرون

۴۴۴ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا: افتادہ
اس مقطع میں سفر کے ذکر سے گمان ہوتا ہے کہ یہ غزل بھی سفرِ کلکتہ کے دوران میں کہی گئی تھی۔

۴۴۵ کچ: ۱۴۴؛ طا: ۳۸۰؛ طب: ۴۵۷

۴۴۷ مصرعِ اولیٰ۔ ل، م: گذشتہ (تبدیلی کی گئی)

۴۴۸ م: طپیدنم (اسلوبِ غالب کے مطابق تبدیلی کردی گئی ہے) اور سب جگہ تپیدنم ہی ہے۔

۴۴۹ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: ندیدنِ تو شنیدم

۴۵۰ مصرعِ ثانی۔ کچ، طا، طب: در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

۴۵۵ مصرعِ اولیٰ۔ کچ، طا، طب: تواضعی نکنم

۴ — خاتمہ

۱ یہ عنوان خطی نسخے میں نہیں تھا؛ ل اور ک میں موجود ہے۔

۲ ل، ک : بدر

۳ ل، ک : گوشی

۴ ل، ک : چشمی ۴ (۱) ل : جنبشی (سہوِ کاتب)

۵ م : ستم ظریفان۔ ک سے درستی کی گئی۔ ل میں بھی ستم ظریفانہ ہی ہے (سہوِ کتابت)

۶ ل، ک : باندازِ فشار

۷ ک میں یہ 'از' سہوِ کاتب سے ساقط ہو گیا ہے۔

۸ ل، ک میں یہ علامتِ جمع نہیں ملتی۔

۹ ل، ک : و لب بسرزنشم

۱۰ ل، ک میں علامتِ جمع نہیں ہے۔

۱۱ ل، ک : مرادر نظر سبک و خود را بر دل گران کردن یعنی چہ

۱۲ ل، ک : و چندین خشمناک چرائی

۱۳ ل : سیم

۱۴ ل : خود (سہوِ کاتب)

۱۵ 'بسر و زے لے کر 'نادانی' تک تمام منادیٰ کی جگہ ل، ک میں صرف ایک لفظ 'بیخبر' آیا ہے۔

۱۶ ل، ک : آیم

۱۷ ل میں 'برخاستہ ام' کی جگہ 'و آزرم' ہے۔ ک : 'ارزم'

۱۸ 'است' ل، ک سے ساقط ہے۔

۱۹ ل : خود (سہوِ کتابت)

۲۰ ل، ک : بی پروائی

۲۱ ل، ک: گرانمایگی

۲۲ 'شکرم' سے لے کر یہاں تک کی عبارت ل، ک میں نہیں ملتی۔

۲۳ ل، ک: ارمغان فرستم

۲۴ ل، ک: دہم

۲۵ ل، ک: خدا

۲۶ ل، ک سے ساقط ہے۔

۲۷ ل، ک: آن

۲۸ ل، ک: توانی

۲۹ ل، ک سے ساقط ہے۔

۳۰ 'ایدون' سے یہاں 'من' تک عبارت ل، ک دونوں جگہ نہیں ہے۔

۳۱ ل: از شکستِ دل؛ ک: از سازِ شکستِ دل

۳۲ ل، ک: بر فروزندهٔ

۳۳ ل، ک: بر فرازندهٔ

۳۴ یہ 'را' ل میں نہیں ہے۔

۳۵ ل: بہ سبکروحی

۳۶ ل: بنالہ ہای

۳۷ م: ست (سہوِ کتابت)

۳۸ ل: دادے (سہوِ کتابت)

۳۹ ل: نگاشتہ ہا

۴۰ ل: از (سہوِ کتابت)

۴۱ ل: ست

۴۲ ل، ک: دستانیان

۴۳ ل: دانست (سہوِ کتابت)

۴۴ ل، ک : باہم

۴۵ ل میں یہ عنوان نہیں ہے۔

۴۶ ل : حلم (سہوِ کتابت)

۴۷ ل، ک : ملک العلاّم

۴۸ ل، ک : محمل

۴۹ ل : گردد

۵۰ ل میں یہ 'را' نہیں ہے۔

۵۱ م : دہر (ک سے درستی کی گئی)؛ ل : رہد

۵۲ م : محالا (سہوِ کتابت)

۵۳ ل : سلام (سہوِ کتابت)

۵۴ ل : ہبر گردید (سہوِ کتابت)؛ م کا متن درست ہے۔

۵۵ م، ک : نو ؛ ل : نوا

۵۶ ل : بہر (سہوِ کتابت)۔ ک، طا، طب سب جگہ مطابقِ م

۵۷ م : ترخوانی (سہوِ کتابت)

۵۸ ل : براین

۵۹ ل میں اس کے بعد واوِ عاطفہ ہے جو غالباً سہوِ کاتب ہے۔ ک بھی م کے مطابق ہے۔

۶۰ ل : ورودِ الم (سہوِ قرأت)

۶۱ ل سے ساقط ہے۔

۶۲ ک : اَوَد

۶۳ ک : درِ اسوۂ دودۂ آلِ محمد را دار السّرورِ ورود کردم۔

۶۴ ل : مصاریع (سہوِ کتابت)

۶۵ ل : گردد و

۶۶ م : سرِ سرو کردہ؛ ل : سرو سرگردہ؛ ک : سرو سر کردہ۔ میرے خیال میں ک درست ہے، اور یہی متن یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

کتابیات

ان کتابوں کی فہرست جن سے مقدمہ اور حواشی کی ترتیب میں مدد لی گئی

آزاد، محمد حسین : آب حیات (لاہور، بار دہم)

حالی، الطاف حسین : یادگار غالب (لاہور ۱۹۶۳ء)

حزیں، محمد علی : کلیاتِ حزیں (نولکشور، لکھنؤ ۱۸۷۶ء)

شمس اللہ قادری : عمادیہ (حیدرآباد ۱۳۴۴ھ)

صائب، محمد علی : کلیاتِ صائب (مرتبہ امیری فیروز کوہی) (تہران ۱۳۳۶ شمسی)

ظہوری، نورالدین : دیوان ظہوری (نولکشور، لکھنؤ ۱۸۹۷ء)

غالب، اسداللہ خان: باغ دو در (مرتبہ وزیرالحسن عابدی) (لاہور ۱۹۷۰ء)

پنج آہنگ (طبع اول) (مطبع سلطانی، دلی ۱۸۴۹ء)

پنج آہنگ (طبع دوم) (مطبع دارالسلام، دلی ۱۸۵۳ء)

خطوط غالب (مرتبہ مالک رام) (لکھنؤ ۱۹۶۲ء)

دیوان اردو (طبع اول) (مطبع سیدالاخبار دلی ۱۸۴۱ء)

دیوان اردو (طبع چہارم) (مطبع نظامی، کانپور ۱۸۶۲ء)

دیوان اردو یعنی نسخۂ حمیدیہ (مرتبہ محمد انوار الحق) (آگرہ ۱۹۲۱ء)

دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ (مرتبہ حمید احمد خان) (لاہور ۱۹۶۹ء)

دیوان اردو نسخۂ عرشی (مرتبہ امتیاز علی عرشی) (رامپور ۱۹۷۰

دیوان غالب نسخۂ عرشی زادہ (مرتبہ اکبر علی خان) (دلی ۹۶۹

دیوان غالب (بیاض غالب بخط غالب)

نقوش (غالب نمبر ۲) (لاہور ۱۹۶۹ء)

	دیوان فارسی (قلمی نسخہ)	(مکتوبہ ۱۲۵۳ء)
	دیوان فارسی (طبع اول)	(مطبع دارالسلام دلی ۱۸۴۵ء)
	دیوان فارسی (طبع دوم)	(نولکشور، لکھنؤ ۱۸۶۳ء)
	عود ہندی	(شیخ مبارک علی، لاہور)
	کلیات نثر فارسی (قلمی نسخہ)	
	کلیات نثر فارسی	(نولکشور، لکھنؤ ۱۸۶۸ء)
	نامہ ہای فارسی غالب (مرتبہ سید اکبر علی ترمذی)	(دلی ۱۹۶۹ء)
مالک رام :	ذکر غالب (طبع چہارم)	(دلی ۱۹۶۴ء)
نجم الغنی :	تاریخ اودھ (۴)	(نولکشور، لکھنؤ ۱۹۲۰ء)
وصی الحسن بلگرامی :	روضۃ الکرام شجرہ سادات بلگرام	(لکھنؤ ۱۹۴۱ء)